183
سیریز
منصوبے کا قاتل
محمود، فاروق، فرزانہ اور انسپکٹر جمشید

اشتیاق احمد

سیریز

محمود فاروق فرزانہ اور انسپکٹر جمشید

127

منصوبے کا قاتل

اشتیاق احمد

ناشر : طاہر ایس ملک
تزئین : محمد سعید نامدار
سرورق : انداز

اس ناول کے تمام واقعات، مقامات اور کردار فرضی ہیں۔ کسی قسم کی مشابہت یا مطابقت محض اتفاقی امر ہوگی جس کے لیے مصنف یا پبلشر ذمہ دار نہ ہوں گے۔

طاہر ایس ملک
نے (صفدر علی) دار عبدالرشید پرنٹرز لاہور
سے چھپوا کر
انداز پبلی کیشنز (مطبوعات اشتیاق) لاہور
سے شائع کیا۔

قیمت : [illegible] روپے

انداز پبلی کیشنز
سیکنڈ فلور میاں مارکیٹ، غزنی سٹریٹ
اردو بازار۔ لاہور۔

مطبوعاتِ اشتیاق
۱۲/۹ نصیر آباد، مسلم پورہ، سانڈہ کلاں لاہور
فون : ۷۲۴۹۳۵۶ — ۷۱۱۲۹۶۹

حدیث شریف

حضرت ابو امامہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :

قیامت کے دن مرتبے کے اعتبار سے (خدا کے نزدیک) بدترین انسان وہ ہوگا جو دوسروں کی دُنیا بنانے میں اپنی آخرت برباد کر دے —

(راوہ ابنِ ماجہ، مشکوٰۃ)

تشریح :—

یعنی دوسروں کو خوش کرنے اور انہیں دنیاوی فائدہ پہنچانے کے لیے ہر جائز و ناجائز حرکت کر ڈالے، جس کے نتیجے میں خود اسے آخرت کے عذاب کا نشانہ بننا پڑے —

ناول پڑھنے سے پہلے یہ دیکھ لیں کہ:

- یہ وقت نماز کا تو نہیں —
- آپ کو سکول کا کوئی کام تو نہیں کرنا —
- کل آپ کا کوئی ٹسٹ یا امتحان تو نہیں —
- آپ نے کسی کو وقت تو نہیں دے رکھا —
- آپ کے ذمے گھر والوں نے کوئی کام تو نہیں لگا رکھا

اگر ان باتوں میں سے کوئی ایک بات بھی ہو تو ناول الماری میں رکھ دیں۔ پہلے نماز اور دوسرے کاموں سے فارغ ہو لیں۔ پھر ناول پڑھیں۔ شکریہ:

مخلص
اشتیاق احمد

دو باتیں

السلامُ علیکم —

گزشتہ ماہ ایک اشتہار دیا گیا تھا۔ کہ جن قارئین کے پاس میرے اب تک شائع ہونے والے تمام ناول موجود ہوں، وہ مجھے اطلاع دیں۔ اس سلسلے میں بہت سے خطوط موصول ہو چکے ہیں، لیکن ایک خط کا ذکر کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کراچی سے سید اعجاز حسین کاظمی صاحب لکھتے ہیں کہ میرے پاس تو آپ کے تمام ناول ہی نہیں، تمام چھوٹی بڑی کہانیاں بھی موجود ہیں جو کتابی شکل میں شائع ہو چکی ہیں، یہی نہیں، وہ تمام رسائل تک موجود ہیں جن میں آپ کی کہانیاں شائع ہوتی ہیں، لہذا میرا تحفہ ارسال کر دیں، لیکن میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ یہ دعویٰ تو اور لوگ بھی کر سکتے ہیں، پھر آخر آپ کس کس کو تحفہ ارسال کریں گے اور دعوے کی سچائی کس طرح معلوم کریں گے۔

اس سلسلے میں عرض ہے کہ دعوے کی سچائی کے بغیر

تو کسی کو بھی تحفہ ارسال نہیں کر سکتا ، کیونکہ میرے قارئین تو ہزاروں ہیں ، مرف خط ملنے پر اگر تحائف ارسال کرنے لگوں تو ضرور چند ہی ماہ میں کنگال ہو جاؤں گا — فکر نہ کریں ، میرے پاس ایسے گُر ہیں کہ میں یہ معلوم کر سکوں کہ کس کا دعویٰ سچا ہے اور کس کا جھوٹا — اور یہ معلوم ہو جانے کے فوراً بعد تحفہ ضرور ارسال کیا جائے گا —

میرے لیے تو یہی بہت خوشی کی بات ہے کہ قارئین میں سے کچھ ایسے دیوانے بھی ہیں جنہوں نے ایک ایک چیز سنبھال کر رکھی ہے — جبکہ خود میرے پاس مکمل ریکارڈ نہیں ہے — سبحان اللہ !

پھنک لو

"سُنا ہے ، تم بہت چالاک ہو ، بہت ذہین ہو ، تیز طرار ہو ، اُڑتی چڑیا کے پر گن لیتے ہو — تیل بھی دیکھتے ہو اور تیل کی دھار بھی — باتونی بھی ہو ، چھلاوے کی طرح چھلانگیں بھی لگا لیتے ہو ، جرائم کا سُراغ لگانا تمھارا روزمرہ کا معمول ہے ، لیکن میں سمجھتا ہوں ، تم میں ایسی ایک بات بھی نہیں ، تم بلاوجہ مشہور ہو گئے ہو ، ہو سکتا ہے ، تمھاری شہرت میں تمھارے والد کا ہاتھ ہو اور تم خود کچھ بھی نہ ہو ، یہی جاننے کے لیے میں نے ایک پروگرام ترتیب دیا ہے ، یہ پروگرام تمھارے لیے ایک چیلنج بھی ہے ، لیکن شرط یہ ہے کہ تم اس کا ذکر کسی سے نہیں کرو گے ، اپنے والد سے بھی نہیں اور والدہ سے بھی نہیں ، جونہی میرا یہ خط تمہیں ملے — گھر سے نکل پڑو گے اور شہر سے باہر جانے والی

سڑک پر روانہ ہو جاؤ گے ۔ جونہی شہری حدود ختم
ہوں گی ، تمھیں ایک سُرخ رنگ کی کار نظر آئے
گی ۔ اپنی موٹر سائیکلیں وہیں چھوڑ کر تم اس سُرخ
رنگ کی کار میں بیٹھ جاؤ گے ، کار میں ڈرائیور موجود
ہوگا ، تم اس سے کوئی بات نہیں کرو گے ۔ اس کے
بعد کا پروگرام میں خود تمھیں بتاؤں گا ۔ اگر تمھیں یہ چیلنج
منظور نہ ہو تو گھر سے نہ نکلنا ۔ میں سمجھ لوں گا ، تم
دراصل کچھ بھی نہیں ہو ۔ اور اگر تم گھر سے نکلے ،
لیکن اس خط کے بارے میں کسی کو بتا کر چلے اور
تمھارا تعاقب کیا گیا تو اس صورت میں بھی میں سامنے
نہیں آؤں گا ۔ نہ تمھیں سُرخ کار ملے گی ۔ اب دیکھنا
یہ ہے کہ تم کیا ہو ۔

کالا چور !"

یہ خط ابھی ابھی انھیں ملا تھا ۔ ایک شخص انھیں دے گیا
تھا ، اس وقت تک چونکہ انھوں نے خط نہیں پڑھا تھا ، اس
لیے خط دینے والے پر محمود کوئی خاص توجہ نہیں دے سکا
تھا ۔ خط پڑھ کر انھوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا ۔
ابھی تھوڑی دیر پہلے وہ سکول سے لوٹے تھے اور ابھی انھوں
نے کھانا بھی نہیں کھایا تھا ، سکول کے کام کو ہاتھ بھی نہیں لگایا

تھا :

" اب کیا کریں "؟ فرزانہ بڑبڑائی ۔
" یہ ہمارے خلاف کوئی چال بھی ہو سکتی ہے "۔ محمود بولا ۔
" ہاں ! اس کا امکان بہت زیادہ ہے "۔ فاروق نے سر ہلایا ۔
" اور اگر ہم گھر سے نہ نکلے تو بزدل سمجھے جائیں گے "۔
فرزانہ نے کہا ۔
" تو کیا ہوا ، ہم بزدل ہیں تو نہیں "۔
" بھئی سچ تو یہ ہے کہ میرا جی بے تحاشہ چاہ رہا ہے کہ
گھر سے نکل پڑوں "۔ فرزانہ بولی ۔
" ہوں ۔ خواہش تو میں بھی یہی محسوس کر رہا ہوں "۔ محمود
نے اس کی تائید کی ۔
" اور میں کہوں گا ۔ یہ تو آ بیل مجھے مار والی بات ہو
گی ، کوئی ہمیں بزدل سمجھتا ہے تو سمجھتا رہے ۔ بے وقوف
خیال کرتا ہے تو کرتا رہے ۔ ہمیں کیا ۔ ہمیں تو اپنے کام سے
کام رکھنا چاہیے "۔ فاروق نے جلے کٹے انداز میں کہا ۔
" ہوں ! تو پھر تم یہیں رہو ، ہم دونوں ذرا سرخ کار تک
تو ہو ہی آئیں "۔ محمود اٹھتے ہوئے بولا ۔
" اور کیا ۔ تم امی جان کو بتائے بغیر جاؤ گے "؟
" ہاں ۔ اس کا چیلنج یہی ہے "۔ محمود نے کہا ۔

"تب پھر وہ مجھ سے پوچھیں گی۔ میں کیا کہوں گا؟"

"جو تمہارے دل میں آئے کہہ دینا۔ ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔"

"اس سے تو پھر یہی بہتر ہے کہ میں بھی تم دونوں کے ساتھ چلا چلوں۔ ابا جان اور امی جان کے سوالات سے تو بچ جاؤں گا۔"

"جیسے تمہاری مرضی۔ ویسے ہم جانتے ہیں، تم بن رہے ہو، ہم سے زیادہ تو تمہارا جی چاہ رہا ہے جانے کو۔"

"اچھا۔ کمال ہے۔" فاروق حیران ہو کر بولا۔

"تو پھر کیا خیال ہے۔ چل رہے ہو ہمارے ساتھ۔"

"ہاں! جانا ہی ہوگا۔" اس نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔

"تو پھر آؤ۔ بسم اللہ کرو۔" محمود یہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

یہ گفتگو انھوں نے دبی آواز میں کی تھی، ان کی والدہ باورچی خانے میں تھیں۔ وہ دبے پاؤں دروازے کی طرف بڑھے اور پھر باہر نکل آئے، موٹر سائیکلیں بھی انھوں نے گھر کے سامنے ہی سٹارٹ نہ کیں۔ سڑک پر آکر ان پر بیٹھے اور باہر جانے والی سڑک پر روانہ ہو گئے۔

"لو بھئی۔ ہم نے کالے چور کی یہ شرط تو پوری کر دی کہ کسی کو بھی بتائے بغیر نکل آئے ہیں۔" محمود نے کہا۔

"ہاں! اگرچہ ہے یہ بے وقوفی۔ نہ جانے اس کا پروگرام کیا ہے۔ وہ کیا چاہتا ہے۔ ہمیں، بنا کوئی نہ کوئی سراغ تو ضرور چھوڑ کر جانا چاہیے تھا۔" فاروق نے منہ بنایا۔

"تم بزدل ہو۔" فرزانہ نے بھنا کر کہا۔

"وہ کیسے؟" فاروق ایک دم بولا۔

"اس طرح کہ ہم اس کی ایک ایک شرط پر پورا اتر کر دکھانا چاہتے ہیں، لیکن تم نہیں۔"

"اچھا بابا۔ یونہی سہی۔ آج میں بھی بے وقوف بن جاتا ہوں۔"

"کیا مطلب۔ کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ آج سے پہلے صرف ہم دونوں بے وقوف بنتے رہے ہیں؟"

"میں نے یہ نہیں کہا۔ ویسے تم نتیجہ نکالنے میں پوری طرح آزاد ہو۔ مجھے کوئی اعتراض بھی نہیں۔" فاروق مسکرایا۔

"خیر خیر۔ تم ہی عقل مند بن جاؤ۔" فرزانہ بولی۔

"امی جان جب باورچی خانے سے باہر نکلیں گی تو۔ اور جب وہ دروازہ بھی کھلا پائیں گی تو کس قدر پریشان ہوں گی۔"

"اب یہ سوچ کر خود کو پریشان کرنے کا کیا فائدہ؟" محمود نے مسکرا کر کہا۔

"اور پھر جب ابا جان گھر آئیں گے تو؟"

"کہیں آج تم پر تو تو کا دورہ تو نہیں پڑ گیا۔"

"ہاں پڑ گیا ہے ۔ اور اب یہ دورہ تمھاری طرف کا رُخ کرنے والا ہے۔" فاروق جل گیا۔

"ارے باپ رے ، اللہ بچائے اس دورے سے۔" محمود گھبرا کر بولا۔

"اور دورے والے سے بھی۔" فرزانہ چہک کر بولی۔

"چہک لو ۔ سُرخ کار نظر آنے سے پہلے پہلے چہک لو۔" فاروق نے اسے گھورا۔

"کیوں ۔ کیا سُرخ کار پر یہ لکھا ہُوا ہو گا ۔ کار میں چہکنا منع ہے۔"

"نہیں ! اس میں تو یہ لکھا ہو گا ۔ پھول توڑنا منع ہے۔" فاروق نے جل بھُن کر کہا۔

"ایسا معلوم ہوتا ہے ، جیسے ہم موٹر سائیکلوں پر بیٹھے لڑ رہے ہوں۔" محمود نے کہا۔

"ہاں محمود ۔ تمھارا خیال درست ہے ، لیکن مکمل طور پر نہیں ، اس لیے کہ لڑ صرف فاروق رہا ہے ، میں اور تم تو اس کی باتوں کا جواب دے رہے ہیں ، گویا اپنا بچاؤ کر رہے ہیں دوسرے لفظوں میں مدافعتی جنگ لڑ رہے ہیں۔" فرزانہ جلدی جلدی بولی ۔

"دوسرے لفظوں میں کیا ۔ تم تو تیسرے لفظوں میں بھی کہہ

سکتی ہو۔" فاروق بھلا کب چپ رہنے والا تھا۔

"اور ہم شہر سے باہر نکل آئے ہیں ، لیکن سُرخ کار کا کہیں پتا نہیں۔" محمود نے گویا اعلان کیا۔

"ہو گی آگے کہیں۔" فرزانہ بولی۔

"نہ بھی ہو گی تو کیا ہے ۔ بڑھے چلو ۔ کہیں نہ کہیں تو ۔ کوئی نہ کوئی سُرخ کار نظر آ ہی جائے گی ۔ بس اسی کو مطلوبہ کار سمجھ لینا ۔ چاہے وہ ہو کسی اور کی۔" فاروق نے کہا۔

"معلوم ہوتا ہے ، آج کی تاریخ میں تم جلے بھنے بغیر کوئی بات نہیں کہو گے۔" محمود مسکرایا۔

"بھئی واہ محمود۔" فرزانہ خوش ہو کر بولی۔

"بھئی واہ محمود کیا۔" فاروق نے منہ بنایا۔

"بہت شاندار اندازہ لگایا۔"

"اوہو ۔ یہ کیا ۔" فرزانہ کے منہ سے نکلا۔

"مجھے تو سامنے صرف سڑک نظر آ رہی ہے۔" فاروق بولا۔

"عقل کی آنکھیں استعمال کرو ، کیونکہ عقل کی آنکھیں صرف آگے ہی نہیں ۔ پیچھے بھی دیکھتی ہیں۔"

اب انھوں نے آئینے میں دیکھا ۔ ایک سُرخ رنگ کی کار ان سے کچھ فاصلے پر آ رہی تھی اور درمیانی فاصلہ لمحہ بہ لمحہ کم ہوتا جا رہا تھا ۔

○

"چلو۔ خدا کا شکر کرو۔ سُرخ کار نظر تو آئی۔ آگے نہ سہی۔ پیچھے ہی سہی۔" فارُوق نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"ہاں! ہمیں تو ضرورت ایک عدد سرخ کار کی تھی۔" محمود نے بھی مسکرا کر کہا۔

عین اسی وقت کار زوں کرکے ان سے آگے نکل گئی۔ اور پھر آہستہ ہونے لگی۔ یہاں تک کہ رک گئی۔ انھوں نے بھی موٹر سائیکلیں روک دیں۔ اور نیچے اُتر کر کار کی طرف بڑھے:

"ہوشیار۔ جال ہمارے گرد تنگ ہوتا جا رہا ہے۔" فارُوق بڑبڑایا۔

"اللہ مالک ہے۔ جب اوکھلی میں سر دیا تو موسلوں کا کیا ڈر۔" فرزانہ نے جواب دیا۔

"ڈرائیور نے تو مڑ کر بھی نہیں دیکھا۔" محمود دبی آواز میں بولا۔

"ظاہر ہے، اسے مڑ کر دیکھنے کی ضرورت بھی کیا ہے۔ جانتا ہے۔ ہم بے وقوف لوگ ہیں۔ خود ہی اس کے پاس پہنچ جائیں گے۔"

"یہ بھی کیا یاد کرے گا۔ کیا کسی بے وقوف سے ملاقات ہوئی تھی۔" فرزانہ مسکرائی۔

اور پھر تینوں کار تک پہنچ گئے۔ ڈرائیور نے پیچھے دیکھے بغیر بھرائی ہوئی آواز میں کہا:

"پچھلی سیٹ پر بیٹھ جاؤ۔"

انھوں نے کار کا دروازہ کھولا اور بیٹھ گئے۔

"وہ خط ساتھ لائے ہو؟" اس نے کہا۔

"ہاں!" محمود بولا۔

"مجھے دو۔" اس نے کہا۔

محمود نے خط نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔ وہ ہاتھ کندھے کی طرف لایا اور خط پکڑ لیا۔

"اس کی نقل گھر میں تو نہیں چھوڑ آئے؟"

"نہیں۔ اس طرح تو بزدل ثابت ہو جاتے۔" محمود نے کہا۔

"اپنی والدہ سے کچھ کہہ کر تو نہیں آئے؟"

"بالکل نہیں۔" فارُوق نے کہا۔

"اور کسی کو فون تو نہیں کیا؟"

"قطعاً نہیں۔" فرزانہ بولی۔

"ٹھیک ہے۔ اوہ۔ میں تو بھول ہی گیا۔ کتنی بڑی غلطی ہو چلی تھی۔ نیچے اترو اور موٹر سائیکلوں کو دُور درختوں کے کسی

جھنڈ تک پہنچا آؤ۔"

"جی بہتر!" محمود نے کہا۔

پھر تینوں نیچے اُتر آئے اور موٹر سائیکلیں لے کر جنگل میں داخل ہوئے:

"ابھی بھی وقت ہے۔" فاروق بولا۔

"کس بات کا۔"

"بھاگ نکلنے کا۔ اس جال سے بچنے کا، کیونکہ ابھی کچھ نہیں بگڑا۔"

"ہو سکتا ہے، ہم اس وقت تک پوری طرح گھر بھی چکے ہوں اور ہماری یہ کوشش ہی بزدلی کی دلیل بن جائے۔"

"اچھا بابا — میں سمجھ گیا، تم دونوں پوری طرح ان کے جال میں پھنسنے کی ٹھان چکے ہو۔ خیر چلو۔"

وہ کافی دُور نکل آئے، یہاں تک کہ سُرخ کار دکھائی دینا بھی بند ہو گئی — وہاں انہیں ایک جھنڈ نظر آ گیا۔ موٹر سائیکلیں اس جھنڈ میں رکھ کر وہ سڑک کی طرف مُڑے:

"آخر یہ لوگ کیا چاہتے ہیں۔ کیا صرف ہماری دلیری اور ذہانت کو آزمانا چاہتے ہیں۔"

"ہو سکتا ہے، ان کا کوئی اور مقصد ہو۔ بہرحال جلد ہی ظاہر ہو جائے گا کہ یہ کیا چاہتے ہیں۔"

وہ سڑک کی طرف بڑھتے چلے گئے۔ سُرخ کار جوں کی توں کھڑی نظر آئی۔ آخر وہ اس میں بیٹھ گئے اور سرخ کار چل پڑی — شہر کی بجائے اس کا رُخ جنگل کی طرف ہی رہا۔

"کیا آپ ہمیں کچھ بتانا پسند کریں گے۔"

"ابھی نہیں۔ میں مجبور ہوں۔"

"اچھا! اللہ تعالیٰ آپ کی مجبوری کو ختم فرمائے۔" فاروق نے مُنہ بنا کر کہا۔

"آمین۔" محمود اور فرزانہ ایک ساتھ بولے۔

"کیا آپ یہ بھی نہیں بتا سکتے کہ ہمارا یہ سفر کب تک جاری رہے گا۔"

"نہیں!" اس نے کہا۔

"جیسے آپ کی مرضی — ویسے ہم سمجھ گئے۔" فاروق مسکرا دیا۔

"کیا سمجھ گئے؟" اس نے پوچھا۔

"یہ کہ ہماری ہر بات کے جواب میں آپ کے پاس صرف ایک جواب ہے اور وُہ ہے نہیں۔"

"ہاں! یہ بات بالکل ٹھیک ہے۔" اس نے کہا۔

"ابھی تک ہم آپ کا چہرہ بھی نہیں دیکھ سکے۔ آخر اتنی بھی کیا پردہ داری۔"

"فکر نہ کریں، وقت آنے پر میں آپ کو اپنا چہرہ بھی دکھا دوں گا۔"

"کیا یہ خط آپ نے ہمیں لکھا تھا؟"

"میں اس سوال کا جواب بھی نہیں دے سکتا۔"

"کیا آپ ہی وہ خط لے کر ہمارے دروازے تک آئے تھے؟"

"میرا اب بھی وہی جواب ہے۔"

"تو کیا آپ سے بات چیت کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ کیا ہم آپس میں باتیں کر سکتے ہیں؟"

"ہاں ضرور، لیکن ذرا شیشے چڑھا لیں ۔۔۔ ورنہ اس جگہ سے بہت سخت بدبو آئے گی۔"

انھوں نے جلدی جلدی شیشے چڑھا لیے۔ اچانک انھیں یوں محسوس ہوا جیسے ان کے ذہن تاریکی میں ڈوبتے چلے جا رہے ہوں ۔۔۔

ہلکی سی آواز

"یہ تم یکایک خاموش کیوں ہو گئے۔" بیگم جمشید کی حیرت زدہ آواز باورچی خانے سے گونجی، کوئی جواب نہ پا کر انھوں نے کہا:

"ارے بھئی! میں تم سے کہہ رہی ہوں۔ کیا سو گئے۔"

اب بھی انھیں کوئی جواب نہ ملا تو چونک اٹھیں اور جلدی سے باہر نکلیں، لیکن وہ تینوں صحن میں نظر نہیں آئے۔

"ارے ۔ تم کہاں ہو بھئی۔" انھوں نے ڈرے ڈرے انداز میں کہا۔

اور پھر تو ان کی آنکھوں میں خوف سما گیا۔ پہلے تو وہ لائبریری کی طرف دوڑیں۔ پھر ان کے کمرے میں جھانکا اور اس کے بعد اپنے کمرے کو دیکھا، وہ کہیں بھی نظر نہ آئے۔ ایک بار پھر وہ بلند آواز میں چلائیں:

"محمود، فاروق، فرزانہ ۔ تم کہاں ہو؟"

ان کی آواز دیواروں سے ٹکرا کر رہ گئی ۔ ایسے میں انھیں

بیرونی دروازے کا خیال آیا، وہ دروازے کی طرف لپکیں۔ اسے کھلا پا کر ان کی حیرت اور بڑھ گئی۔ اب انھوں نے تیزی سے سیڑھیاں طے کیں اور چھت پر آئیں، پھر نیچے اتریں اور گھر سے باہر نکل کر بیگم شیرازی کی طرف آئیں، دستک کے جواب میں دروازہ کھلا اور ان کی آواز کانوں سے ٹکرائی:

"خیر تو ہے، آپ بہت پریشان نظر آ رہی ہیں؟"

"ہاں — ایسی ہی بات ہے۔ محمود، فاروق اور فرزانہ آپ کی طرف تو نہیں آئے؟"

"جی — نہیں تو — کیوں کیا ہوا؟"

"وہ گھر میں موجود تھے — اچانک کہیں چلے گئے ہیں — بتائے بغیر کہیں جانا ان کی عادت میں شامل نہیں۔"

"اوہ — آپ نے ان کی موٹر سائیکلیں دیکھیں؟"

"نہیں — اس لیے کہ اگر وہ موٹر سائیکلوں پر گئے ہوتے تو آواز سنائی دے جاتی۔" انھوں نے کہا۔

"پھر بھی آپ دیکھ تو لیں۔"

دونوں جلدی سے پائیں باغ کے اس حصے میں آئیں جس میں موٹر سائیکلیں، جیپ اور کار کھڑی کرنے کی جگہ بنائی گئی تھی — لیکن یہاں موٹر سائیکلیں بھی نہیں تھیں:

"اس کا مطلب ہے، وہ موٹر سائیکلوں پر گئے ہیں، لیکن

اس جگہ سے ہی موٹر سائیکلوں پر نہیں بیٹھے — تاکہ مجھے خبر نہ ہو سکے، لیکن کیوں، انھیں ایسا کرنے کی کیا ضرورت تھی۔" بیگم جمشید بڑبڑائیں۔

"کہیں انہیں کوئی شرارت نہ سوجھ گئی ہو۔"

"مجھ سے وہ کبھی کوئی شرارت نہیں کرتے — اور نہ اپنے ابا جان کے ساتھ — ضرور کوئی اور بات ہے — مجھے دفتر فون کرنا چاہیے۔"

یہ کہہ کر وہ اندر کی طرف بڑھیں۔ بیگم شیرازی نے بھی ان کا ساتھ دیا — اب انھوں نے جلدی جلدی دفتر کے نمبر ڈائل کیے — سلسلہ ملتے ہی اکرام کی آواز سنائی دی:

"ہیلو اکرام — بیگم جمشید بول رہی ہوں — محمود، فاروق اور فرزانہ ادھر تو نہیں آئے؟"

"جی — نہیں تو — خیر تو ہے؟"

"اچھا — فون اپنے صاحب کو دو۔"

"وہ اس وقت دفتر میں نہیں ہیں — دفتر میں ایک اہم میٹنگ ہو رہی ہے — میٹنگ روم کے دروازے بند ہیں — اور تمام لوگوں کو ہدایت ہے کہ میٹنگ میں موجود کسی بھی آفیسر کو پریشان نہ کیا جائے۔"

"اوہ — یہ تو برا ہوا — میٹنگ کب ختم ہو گی؟"

"کچھ نہیں کہا جا سکتا، ہو سکتا ہے ایک آدھ گھنٹے تک ختم ہو جائے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ رات گئے تک جاری رہے۔"

"رات گئے تک۔" انھوں نے گھبرا کر کہا۔

"جی ہاں! لیکن بات کیا ہے؟"

"بات بہت عجیب ہے۔" انھوں نے کہا اور تفصیل سنا دی۔

"لیکن بیگم صاحبہ — میرے خیال میں تو یہ ایسی کوئی پریشانی والی بات نہیں ، صاف نظر آ رہا ہے، وہ جہاں بھی گئے ہیں، اپنی مرضی سے اور نہایت اطمینان سے گئے ہیں۔"

"لیکن اکرام — یہ ان کی عادت کے بالکل خلاف ہے — وہ کہیں بھی جائیں، بتائے بغیر کبھی نہیں جاتے — مجھ سے اجازت نہ ملنے کا خوف بھی انھیں نہیں ہوتا، کیونکہ میں نے انھیں کبھی بھی روکنے کی کوشش نہیں کی، ان حالات میں میں سمجھتی ہوں، معاملہ خطرناک ہی ہے — کیا کوئی ایسا طریقہ نہیں ہو سکتا کہ تم میری بات اپنے صاحب سے کرا دو؟"

"افسوس — آئی جی صاحب کے احکامات بہت سخت ہیں۔"

"کانفرنس روم کے فون کا نمبر کیا ہے؟" انھوں نے پوچھا۔

"افسوس! میں وہ نمبر بھی نہیں بتا سکتا — ورنہ نزلہ مجھ پر ہی گرے گا۔"

"ہوں! اچھا تو پھر تم اپنے طور پر ان کی تلاش کے سلسلے

میں تو کچھ کر ہی سکتے ہو؟"

"ہاں ضرور — یہ کوئی مسئلہ نہیں۔"

"تو پھر تم اپنی کوشش شروع کر دو — اور میں اپنی کوشش کرتی ہوں۔"

"اپنی کوشش — کیا مطلب؟" اکرام چونکا۔

"انسپکٹر صاحب سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش۔" وہ مسکرائیں۔

"بھلا یہ آپ کس طرح کر سکیں گی — جب کہ آپ کو نمبر تک معلوم نہیں اور دفتر کا کوئی آدمی بھی آپ کو نمبر نہیں بتائے گا۔" اکرام نے حیرت زدہ انداز میں کہا۔

"اس کے باوجود میں اپنی سی کوشش کروں گی۔"

"جی بہتر — ضرور کریں — بھلا میں کیا کہہ سکتا ہوں۔"

انھوں نے ریسیور رکھ دیا اور سوچ میں ڈوب گئیں — آخر خان رحمان کے نمبر گھمائے — جلد ہی خان رحمان کی آواز سنائی دی:

"خیر تو ہے بھابی۔"

"ایک پریشان کن سا معاملہ ہے — تفصیل سنیئے۔" یہ کہہ کر انھوں نے ساری تفصیل سنا دی۔

"آپ مجھ سے کیا چاہتی ہیں؟"

"کسی طرح اپنے دوست کو یہ اطلاع دے دیں۔"

"اچھا! میں کوشش کرتا ہوں۔ جونہی میں اپنی کوشش میں کامیاب ہوا، آپ کو فون کر دوں گا۔"

"اچھی بات ہے، میں بہت بے چینی سے انتظار کر رہی ہوں۔" یہ کہہ کر انھوں نے ریسیور رکھ دیا۔

پندرہ منٹ بعد فون کی گھنٹی بجی، اور خان رحمان کی آواز سنائی دی:

"ہیلو بھابی — نہایت افسوس سے یہ خبر سنا رہا ہوں کہ میں اپنی کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکا — ویسے ہم آپ کے ہاں آ رہے ہیں — فکر نہ کریں۔"

"بہت بہت شکریہ۔" انھوں نے کہا اور پروفیسر داؤد کے نمبر گھمائے، انھیں بھی صورتِ حال بتائی، وہ سن کر بولے:

"یہ کون سا مشکل کام ہے — میں ابھی جمشید سے رابطہ قائم کر کے دکھاتا ہوں۔"

"بہت بہت شکریہ۔" انھوں نے خوش ہو کر کہا۔

دس منٹ بعد پروفیسر داؤد کا فون ملا، وہ کہہ رہے تھے:

"بھابی — مجھے افسوس ہے — میں کامیاب نہیں ہو سکا — ویسے میں اور شائستہ آپ کے ہاں پہنچ رہے ہیں۔"

"شکریہ!" انھوں نے کہا اور ریسیور رکھ کر سوچ میں گم ہو گئیں — ان کی تینوں کوششیں ناکام ہو چکی تھیں — کچھ سوچ کر

انھوں نے اکرام کو پھر فون کیا:

"ہاں اکرام — کیا کیا؟"

"میں نے تمام تھانوں کو اطلاع کر دی ہے — اپنے خاص آدمی بھی ان کی تلاش میں روانہ کر دیے ہیں — آپ پریشان نہ ہوں — بہت جلد ان کا سراغ مل جائے گا۔"

"ہوں! اور میٹنگ کا کیا رہا، کیا اس کے ختم ہونے کے امکانات ہیں یا نہیں؟"

"جی نہیں — کوئی خبر نہیں — ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے کوئی بہت ہی سنجیدہ میٹنگ ہو رہی ہے — شاید آج سارے دفتر کو تمام رات ڈیوٹی پر رہنا پڑے گا، کیونکہ جب تک میٹنگ ختم نہیں ہوتی — باقی لوگ بھی چھٹی نہیں کر سکتے۔"

"اوہ! اس میٹنگ کو بھی آج ہی ہونا تھا۔" انھوں نے تلملا کر کہا اور ریسیور رکھ دیا۔

اسی وقت دروازے کی گھنٹی بجی — انداز خان رحمان کا تھا۔ انھوں نے اُٹھ کر دروازہ کھول دیا:

"کچھ معلوم ہوا بھابی؟" بیگم خان رحمان بولیں۔

"ابھی تک نہیں — آئیے — آپ اندر آئیے۔"

وہ صحن میں آ کر بیٹھ گئے:

"آپ نے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کس طرح کی تھی؟" بیگم جمشید

نے پوچھا۔

"پہلے دفتر کے ذریعے، پھر ڈی آئی جی صاحب کی بیگم صاحبہ کے ذریعے — لیکن ڈی آئی جی صاحب کی ان سے بھی بات نہیں کرائی گئی۔"

"اوہ!"

جلد ہی پھر دروازے کی گھنٹی بجی، اس مرتبہ پروفیسر داؤد اور شائستہ آئے تھے:

"اور آپ نے کوشش کس طرح کی تھی؟"

"میں نے آئی جی صاحب کے گھر فون کیا تھا اور ان کی بیگم کے ذریعے فون کرانے کی کوشش کی تھی، لیکن ناکامی ہوئی۔"

"خدا اپنا رحم کرے — نہ جانے وہاں کتنا اہم مسئلہ درپیش ہے۔" خان رحمان بڑبڑائے۔

"مشکل یہ ہے کہ ہمیں بھی زبردست الجھن درپیش ہے۔" بیگم جمشید بولیں۔ پھر اچھل پڑیں:

"اوہ — اوہ — میں ایک کوشش اور کروں گی۔"

یہ کہہ کر انھوں نے ریسیور اٹھایا اور نمبر گھمانے لگیں۔

"اب کسے فون کرنے کا ارادہ ہے؟" خان رحمان حیران ہو کر بولے۔

"بس دیکھتے جائیے۔" وہ بولیں — اور پھر پندرہ منٹ کی کوشش

کے بعد رابطہ قائم کرنے میں کامیاب ہوئیں:

"ہیلو سر — بیگم جمشید عرض کر رہی ہوں — زندگی میں پہلی بار آپ کو فون کرنے پر مجبور ہوں — آپ کو زحمت دے رہی ہوں، لیکن کیا کیا جائے اس کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہیں۔"

"کوئی بات نہیں — کہیے، میں کیا خدمت کر سکتا ہوں۔" دوسری طرف سے ایک باوقار آواز سنائی دی۔

"محکمۂ سراغرسانی کے میٹنگ روم میں اس وقت ایک میٹنگ ہو رہی ہے — کوئی بہت ہی اہم نوعیت کی میٹنگ — اس میں شریک آفیسرز سے کسی کو بھی بات کرنے کی اجازت نہیں، لیکن مجھے انسپکٹر جمشید صاحب کو ایک بہت ضروری پیغام دینا ہے — کیا آپ اس سلسلے میں میری مدد کر سکتے ہیں؟"

"افسوس! نہیں — میں جانتا ہوں — میٹنگ کیوں ہو رہی ہے، اور یہ میری ہی ہدایات ہیں کہ باہر سے کوئی آدمی بھی دخل اندازی نہ کرنے پائے۔" دوسری طرف سے کہا گیا۔

"اوہ!" ان کے منہ سے نکلا۔

"مجھے بہت افسوس ہے کہ آپ کے کام نہیں آسکا۔"

"اچھا جناب شکریہ۔" انھوں نے کہا اور ریسیور رکھ دیا۔

"بات نہیں بنی — کیوں؟" خان رحمان بولے۔

"ہاں! میں ایک بار پھر ناکام ہو گئی ہوں۔"

"فون کسے کیا تھا؟"

"وزیرِ خارجہ صاحب کو۔"

"اوہ۔ وہ بھی بات نہیں کرا سکے۔" پروفیسر داؤد کے لہجے میں حیرت تھی۔

"اس لیے کہ یہ ہدایات، انھوں نے ہی دے رکھی ہیں۔" انھوں نے بُرا سا منہ بنایا۔

"میری رائے تو یہ ہے کہ آرام سے بیٹھا جائے۔ اس سلسلے میں کوئی کوشش نہ کی جائے۔ اللہ مالک ہے۔" پروفیسر داؤد بولے

"اپنی طرف سے کوشش کرنا بھی فرض ہے۔" بیگم خان رحمان نے کہا۔

"کچھ بھی ہو۔ میں ایک آخری کوشش اور کروں گی۔" بیگم جمشید نے پُختہ لہجے میں کہا اور فون کا ریسیور اٹھا لیا۔

اس بار انھیں رابطہ قائم کرنے میں تقریباً نصف گھنٹا لگا۔ آخر انھوں نے کہا:

"بیگم جمشید عرض کر رہی ہوں۔" تعارف کرانے کے بعد انھوں نے ساری صورتِ حال دہرا دی:

"تو کیا آپ کا انسپکٹر جمشید صاحب سے بات کرنا اتنا ہی ضروری ہے؟"

"اگر یہ اتنا ضروری نہ ہوتا تو میں آپ کو زحمت کیوں دیتی۔

جب کہ آپ سے پہلے میں وزیرِ خارجہ صاحب سے درخواست کر چکی ہوں۔ پروفیسر داؤد، آئی جی صاحب کی بیگم اور خان رحمان ڈی آئی جی صاحب کی بیگم کے ذریعے کوشش کر چکے ہیں، لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔"

"اوہ۔ میٹنگ واقعی اسی نوعیت کی ہے۔ مجھے بھی معلوم ہے کہ میٹنگ ہو رہی ہے اور اس قسم کی ہدایات ہیں، لیکن خیر۔ پہلے آپ یہ بتائیں کہ آپ کیوں پریشان ہیں؟"

"محمود، فاروق اور فرزانہ پُراسرار طور پر غائب ہیں۔"

"اوہ۔ یہ تو بہت بُرا ہوا۔ اب اگر میں آپ کی بات انسپکٹر جمشید سے کرا دوں تو وہ پریشان ہو جائیں گے اور میٹنگ کی کارروائی میں پوری توجہ نہیں دے سکیں گے۔ میٹنگ سے انھیں اُٹھنے کی اجازت بھی نہیں دی جا سکے گی۔ لہٰذا اس کا کیا فائدہ ہوگا۔"

"یہ نہیں کہا جا سکتا سر کہ فائدہ نہیں ہوگا۔ ہو سکتا ہے، اس کا کوئی بہت بڑا فائدہ ہو جائے۔" وہ بولیں۔

"وہ کیسے؟"

"سنیے۔ میں بھی دراصل اسی امکان کی وجہ سے پریشان ہوں۔ ہو سکتا ہے، مجرم کو بھی اس میٹنگ نے ہی پریشان کر رکھا ہو۔ اور اس نے یہ منصوبہ بنایا ہو کہ کسی طرح انسپکٹر صاحب

کو میٹنگ سے خارج کرا دے۔ ان حالات میں بظاہر یہی کہا جائے
گا کہ تب تو انھیں اِطلاع نہیں دینی چاہیے، لیکن وُہ اس
اِطلاع سے خاطر خواہ فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔ محمود، فارُوق اور
فرزانہ کی گم شدگی انھیں ذرا پریشان نہیں کرے گی۔ اور میں
بھی ان سے دراصل محمود، فاروق اور فرزانہ کی وجہ سے بات
نہیں کرنا چاہتی۔ مقصد تو صرف یہ ہے کہ وُہ حالات سے باخبر
ہو جائیں۔"

"ہوں۔ بات بہت اہم ہے۔ اچھا۔ میں ان سے بات
کرتا ہوں۔ کیا صرف میں یہ اطلاع دے دوں یا آپ ہی
دینا چاہتی ہیں؟"

"جی نہیں۔ اس طرح وقت ضائع ہو گا۔ بس آپ ہی
انھیں یہ اِطلاع دے دیں۔"

"اچھی بات ہے۔ آپ فکر نہ کریں، میں ابھی فون کرتا ہوں۔"
دوسری طرف سے کہا گیا۔

اور انھوں نے شکریہ کہہ کر ریسیور رکھ دیا:

"کیا صدر صاحب کو فون کیا تھا؟"

"ہاں! اور انھوں نے انسپکٹر صاحب کو پیغام دے دینے کا
وعدہ کر لیا ہے۔"

"چلو۔ مسئلہ حل ہو گیا۔ آپ کی کوشش کامیاب ہو گئی۔"

بیگم شیرازی مسکرائیں۔

"سوال تو یہ ہے کہ محمود، فاروق اور فرزانہ کہاں ہیں؟" پروفیسر
داؤد بولے۔

"واقعی بہت پریشان کن سوال ہے۔ کیوں نہ ہم سب ان کی
تلاش میں نکل کھڑے ہوں۔" خان رحمان بولے۔

"اوہ! یہ پروگرام بھی مناسب رہے گا۔" بیگم جمشید خوش ہو
کر بولیں۔

"تو پھر ہم دو کاروں میں چلتے ہیں۔ بیگم شیرازی۔ آپ کیا
کہتی ہیں؟" پروفیسر داؤد بولے۔

"اس مہم میں مَیں بھی آپ کا ساتھ دوں گی۔"

"پروفیسر صاحب۔ مجھے ابھی ابھی ایک زور دار خیال سوجھا
ہے۔"

"ان کی تلاش کے سلسلے میں؟" پروفیسر صاحب چونک کر بولے۔

"جی نہیں۔ آپ کے بارے میں۔" خان رحمان مسکرائے۔

"کیا مطلب۔ میرے بارے میں۔" پروفیسر داؤد حیرت زدہ
ہو کر بولے۔

"جی ہاں۔ ذرا میرے ساتھ ادھر آئیے۔" انھوں نے کہا اور
ہاتھ پکڑ کر دُور چلے گئے:

"ابھی ابھی۔ یہ بات ذہن میں آئی ہے اور زندگی میں پہلی

یار آئی ہے — کیوں نہ آپ بیگم شیرازی سے شادی کر لیں — بے چاری بیوہ ہے — اور ادھر آپ کی بیگم مدت ہوئی وفات پا چکی ہیں — یہ ایک نیک کام ہو گا۔"

"نہیں خان رحمان — میں اپنی بیٹی کے لیے ایک سوتیلی ماں نہیں لا سکتا۔"

"وہ پرانے خیال کی نہیں ہیں، شائستہ سے کوئی بُرا سلوک نہیں کریں گی۔" خان رحمان بولے۔

"لیکن شاید یہ تجویز شائستہ کو ناگوار گزرے — اور میں اس کی طبیعت پر بوجھ نہیں بن سکتا۔"

"تو ہم شائستہ سے آزادانہ رائے لے لیتے ہیں۔" خان رحمان نے کہا —

"لیکن خان رحمان — یہ موقع ان باتوں کا کیا ہے — ہم تو محمود، فاروق اور فرزانہ کی تلاش میں جا رہے ہیں۔" پروفیسر داؤد بولے —

"ہاں — یہ تو ہے — خیر آئیے — اس معاملے پر جمشید کی موجودگی میں بات کریں گے۔"

وہ باہر نکلے اور دونوں کاروں میں بیٹھ کر سڑک کی طرف روانہ ہوئے — سڑک کا موڑ مڑتے ہی خان رحمان کی کار کا ایک ٹائر دھماکے سے پھٹا — ساتھ ہی انھوں نے ایک

ہلکی سی آواز سنی تھی - خان رحمان اس ہلکی سی آواز سے بخوبی واقف تھے، وہ کانپ اُٹھے اور چلّا کر بولے :

"نیچے جھک جاؤ — کسی نے فائر کیا ہے۔"

وہ مر چکا تھا

میٹنگ روم میں سب کے چہرے سفید تھے — یوں لگتا تھا، جیسے ان کے جسموں سے خون سلب کر لیا گیا ہو — یہ میٹنگ اچانک بلائی گئی تھی — وزیرِ خارجہ کا فون ملا تھا اور انھوں نے ہی ہدایات دی تھیں — ابھی ابھی آئی جی صاحب نے ان کا ایک پیغام پڑھ کر سب کو سنایا تھا اور وہ پیغام سن کر ان کے چہرے زرد پڑ گئے تھے — اس کے الفاظ یہ تھے :

"پچھلے ماہ ہم نے محکمہ سراغرسانی کے تمام بڑے بڑے آفیسرز کے ساتھ بیٹھ کر ایک منصوبہ بنایا تھا، اس منصوبے کا تعلق ہمارے دشمن ملک سے تھا — یہ بات آپ سب کو معلوم تھی اور یہ بھی کہ منصوبہ کس حد تک اہم نوعیت کا ہے — اس منصوبے کا تعلق آئندہ ہونے والی جنگ سے تھا، لیکن یہ منصوبہ چونکہ غیر فوجی تھا، اس لیے ملٹری ہیڈ کوارٹر کی بجائے

یہاں ترتیب دیا گیا تھا؛ تاہم اس میں ملٹری کے چند بڑے آفیسرز بھی شریک تھے — آخر منصوبہ طے پا گیا — اور اس پر عمل درآمد کی منظوری صدر صاحب نے دے دی، لیکن دشمن ملک میں موجود ہمارے ایک جاسوس نے ہمیں اطلاع دی ہے کہ ہمارے ایک منصوبے کی مکمل تفصیلات دشمن ملک کے محکمۂ خارجہ کو کسی ذریعے سے موصول ہوئی ہیں — جو تفصیلات اس جاسوس نے بتائی ہیں، ان کے مطابق ہمارا منصوبہ اب راز نہیں رہا — اور اب ہم اس پر عمل بھی نہیں کر سکتے، دوسرے یہ کہ دشمن ملک کو ہمارے ارادوں کے بارے میں پوری طرح معلوم ہو گیا ہے — گویا ہماری پوزیشن حد درجے نازک ہو گئی ہے —

سوال یہ ہے کہ منصوبے کی تفصیلات دشمن ملک کے محکمۂ خارجہ تک کس طرح پہنچیں — وہ تو شکر ہے کہ اس محکمہ میں ہمارا ایک جاسوس موجود ہے، ورنہ ہوتا یہ کہ ہم بے خبری میں اپنے اس منصوبے پر عمل کرتے رہتے اور جنگ میں ہمیں وہ ناکامی ہوتی کہ خدا کی پناہ — صاف ظاہر ہے — ہم میں کوئی غدار موجود ہے۔ اس غدار نے ہی تمام تفصیلات دشمن ملک تک پہنچائی

ہیں۔ میرا حکم یہ ہے کہ یہ اجلاس اس جاسوس کو گرفتار کرنے کے بعد اٹھے گا۔ جب تک اس کا سراغ نہیں لگ جائے گا، میٹنگ جاری رہے گی۔ آپ سب کو میٹنگ سے ایک گھنٹا پہلے اسی لیے باخبر کر دیا گیا تھا کہ معلوم ہو جائے۔ میٹنگ مختصر نہیں ہو گی، بہت طویل بھی ہو سکتی ہے۔ لہٰذا آپ لوگ ذہنی طور پر تیار ہو کر ہی آئے ہیں۔ واضح ہو کہ اس میٹنگ میں وہ سب لوگ موجود ہیں، جنھوں نے منصوبہ بنایا تھا۔ اس منصوبے کا تعلق صرف دشمن ملک کے عوام سے تھا۔ جب عوام میں بزدلی پھیل جاتی ہے تو پھر فوجیں بھی ہمت ہار جاتی ہیں اور جب عوام کے حوصلے بلند ہوتے ہیں تو فوجیں بھی بڑی ڈھارس محسوس کرتی ہیں۔ اس اصول کی بنیاد پر منصوبہ بنایا گیا تھا، لیکن افسوس! اب اس کی ایک ایک تفصیل سے دشمن ملک آگاہ ہو چکا ہے اور ہم اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ منصوبے کا نام ہم نے منصوبہ ہ م رکھا تھا۔ سوال یہ ہے، منصوبہ ہ م کا قاتل کون ہے؟"

ان الفاظ نے ان کے رنگ سفید کر دیے۔ کئی منٹ تک موت کی خاموشی طاری رہی، آخر آئی جی صاحب بولے:

"آپ حضرات نے حکم سن لیا۔ اب فرمائیے کیا کرنا ہے؟"

"ہم اس قاتل کو پکڑنے کے سوا اور کیا کر سکتے ہیں۔" ڈی آئی جی صاحب بولے۔

"ہاں! لیکن سوال یہ ہے کہ اسے کس طرح گرفتار کیا جائے، وہ ہم سب میں سے ایک ہے۔ کیا اس کمرے میں رہ کر تفتیش کی جا سکے گی؟"

"وزیر خارجہ صاحب کا حکم ہے۔ لہٰذا کمرے میں رہ کر ہی تفتیش کرنا ہو گی۔" ایک ملٹری آفیسر نے کہا۔

"ہوں ٹھیک ہے۔ تو پھر میں انسپکٹر جمشید کو تفتیش پر مقرر کرتا ہوں۔ وہ ہم میں چھپے منصوبے کے قاتل کو پکڑیں گے۔" آئی جی صاحب نے اعلان کیا۔

"جی بہت بہتر، لیکن سر۔ معاف کیجیے گا۔ منصوبے کا قاتل ہم میں سے کوئی بھی ہو سکتا ہے۔ میں بھی ہو سکتا ہوں اور آپ بھی۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"ٹھیک ہے، تو پھر۔ تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"یہ کہ میں کسی کا لحاظ نہیں کروں گا۔"

"بالکل ٹھیک۔"

"اور میرے ہر سوال کا جواب دینا ہو گا۔"

"ٹھیک ہے۔ ایسا ہی ہو گا۔"

"تو پھر — میری سب سے پہلی درخواست یہ ہے کہ آپ سب لوگ اپنے اپنے ہتھیار اتار دیں — یہاں ایک بڑی الماری موجود ہے — ہتھیار ہم اس میں رکھ دیتے ہیں — غدار کے پکڑے جانے کے بعد واپس کر دیے جائیں گے۔"

"بالکل ٹھیک ہے — یہ بہت ضروری ہے۔"

جلد ہی تمام حاضرین نے اسلحہ نکال کر میز پر ڈھیر کر دیا۔ اور پھر اسے الماری میں بند کر کے تالا لگا دیا گیا —

"چلو جمشید — اب کارروائی شروع کرو، واضح ہو کہ ہماری اس کارروائی میں کوئی بھی دخل نہیں دے سکے گا — کوئی فون نہیں کر سکے گا — ہم اطمینان سے اپنا کام کرتے رہیں گے، ہو سکتا ہے — ساری رات ہمیں یہیں گزارنا پڑے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انسپکٹر جمشید جلد ہی اصل مجرم کو بے نقاب کر دیں۔ اب میں تمام تر اختیارات انسپکٹر جمشید کو سونپتا ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئے — اب انسپکٹر جمشید اپنی کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے، انھوں نے تمام حاضرین پر ایک نظر ڈالی، پھر چونک کر بولے:

"عجیب بات ہے۔"

"کیا مطلب — کیا عجیب بات ہے۔" آئی جی صاحب حیران ہو کر بولے —

"کیا آپ لوگ بتا سکتے ہیں کہ ہم میں سے کس کس نے کوئی ہتھیار میز پر نہیں رکھا۔" انھوں نے مسکرا کر کہا۔

"کیا مطلب — کیا کوئی ایسا بھی ہے جس نے اپنا ہتھیار میز پر نہیں رکھا۔"

"جی ہاں — کم از کم ایک صاحب ایسے ضرور ہیں۔"

"اوہ — وہ — کون ہے۔" آئی جی صاحب نے پر جوش لہجے میں کہا —

"ہمارے محکمہ کے ریکارڈ سیکشن کے انچارج کے ایم جاودانی صاحب —"

"اوہ — جاودانی صاحب — مہربانی فرما کر اٹھ کر کھڑے ہو جائیں۔" ایک پتلا دبلا اور لمبے قد کا آدمی قدرے پریشان صورت لیے اٹھ کھڑا ہوا —

"کیا یہ سچ ہے کہ آپ نے اپنا اسلحہ میز پر نہیں رکھا تھا۔"

"سچ — جی ہاں — یہ — یہ ٹھیک ہے۔"

"لیکن کیوں — کیا آپ نے انسپکٹر جمشید کی ہدایت نہیں سنی تھی۔" ڈی آئی جی منہ بنا کر بولے۔

"سنی تھی سر — بالکل سنی تھی — لل — لیکن۔"

"لیکن آپ نے سوچا — آپ کو تو ہتھیار کی ضرورت پڑے گی، لہٰذا آپ چپ چاپ بیٹھے رہے، لیکن آپ نہیں جانتے، انسپکٹر

جمشید ہمارے محکمے میں عقابی نظر رکھتے ہیں۔"

"واقعی۔ اس میں کوئی شک نہیں۔ ان کے الفاظ سُن کر خود مجھے بھی حیرت ہوئی تھی۔ ورنہ میرا خیال تو یہی تھا کہ مجھے اسلحہ نکال کر نہ رکھتے ہوئے کسی نے نہیں دیکھا۔"

"سب سے پہلے تو آپ اپنا پستول نکال کر میز پر رکھ دیں اور اس کے بعد وجہ بتائیں، آپ نے ایسا کیوں کیا، ان کی ہدایت پر عمل کیوں نہ کیا۔"

"مجھے افسوس ہے۔ میں اسلحہ نکال کر میز پر نہیں رکھ سکتا۔"

"لیکن کیوں؟" ڈی آئی جی چلا اُٹھے۔

"اس لیے کہ میرے پاس اس وقت میرا پستول نہیں ہے، پستول میرے کمرے کی الماری میں موجود ہے۔ میٹنگ میں آتے وقت میں نے اسے ساتھ لانے کی ضرورت نہیں محسوس کی تھی۔"

"اوہ!" ان سب کے مُنہ سے ایک ساتھ نکلا۔

"اس کے باوجود میں آپ کی تلاشی ضرور لوں گا۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"ضرور۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"

انھوں نے آگے بڑھ کر تلاشی لی، لیکن اس کے پاس سے کوئی ہتھیار برآمد نہ ہوا، ان کا چہرہ بُجھ گیا:

"مجھے معاف کر دیجیے گا جاودانی صاحب، لیکن یہ میرا فرض

تھا۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"کوئی بات نہیں۔" اس نے کہا۔

"اگر میں آپ کے گھر کی تلاشی لینا چاہوں تو آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا۔"

"بالکل نہیں ہوگا۔" اس نے کہا۔

"شکریہ، لیکن تلاشی اس طرح لی جائے گی کہ آپ یہیں موجود رہیں گے۔"

"ضرور کیوں نہیں۔" اس نے کہا۔

"اچھا۔ آپ سب لوگ ایک کاغذ پر اپنے اپنے نام اور عہدے لکھ دیں۔ تاکہ میں ایک ترتیب سے اپنا کام شروع کر سکوں۔"

انھوں نے میز پر پڑے گتے میں لگے کاغذ پر باری باری اپنے نام لکھ دیے۔

"جاودانی صاحب۔ میں اپنی تفتیش آپ سے ہی شروع کرتا ہوں۔ آپ اپنے ہاتھ سے ایک رقعہ لکھ کر دے دیں، اس میں لکھ دیں کہ گھر کی آزادانہ انداز میں تلاشی دے دی جائے۔"

"جی بہتر۔" اس نے کہا اور رقعہ لکھنے لگا، پھر اس نے کاغذ انسپکٹر جمشید کی طرف بڑھا دیا۔ انھوں نے کاغذ لیا اور

دروازے پر موجود چار آدمیوں میں سے ایک کو ہاتھ کے اشارے
سے بلایا۔ اس کے نزدیک آنے پر وہ رقعہ اسے دے دیا اور وہ
خاموشی سے واپس مڑا اور کمرے سے نکل گیا۔

" آپ نے اپنے عہدے کا چارج آج سے تین سال پہلے سنبھالا
تھا۔ ٹھیک ہے نا جناب؟" انسپکٹر جمشید بولے۔

" ہاں بالکل۔"

" اور آپ سے پہلے اس سیٹ پر راجہ منور تھے، آپ راجہ منور
کے نائب تھے۔ پھر راجہ منور فوت ہو گئے اور آپ نے ان
کی جگہ سنبھال لی، اس وقت سے آپ انچارج چلے آ رہے
ہیں۔"

" جی ہاں! یہ بات بالکل ٹھیک ہے۔" کے ایم جاودانی نے
جواب دیا۔

" اس وقت سے لے کر آج تک کبھی آپ کی کوئی بدنظمی
سامنے نہیں آئی۔"

" بدنظمی تو خیر اب بھی سامنے نہیں آئی، بس پستول اپنی
الماری میں چھوڑ آیا۔ اور صرف اس وجہ سے آپ کی نظروں
میں آ گیا۔" اس نے بُرا سا منہ بنا کر کہا۔

" فکر نہ کریں، اگر آپ مجرم نہیں ہیں تو میری نظروں میں
آ جانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

" فرق کیوں نہیں پڑتا۔ میرے گھر کی تلاشی جو لی جائے
گی اب۔" اس نے پہلی بار بُرا مان کر کہا۔

" ہاں واقعی۔ اس کا مجھے افسوس ہے۔ خیر۔ م۔ میں۔"
انسپکٹر جمشید کہتے کہتے رک گئے۔ ان کی آنکھیں حیرت
سے پھیل گئیں۔ عین اسی وقت فون کی گھنٹی بج اٹھی۔

فون کی گھنٹی نے ان سبھی کو چونکا دیا۔ اور وہ اس طرح
گھور گھور کر فون کو دیکھنے لگے جیسے اس میں خرابی پیدا ہو
گئی ہو، کیونکہ اس نمبر پر کسی کا فون آنے کا امکان نہیں
تھا۔ سب کو معلوم تھا۔ کوئی ان سے رابطہ قائم نہیں کر سکتا۔

" حیرت ہے۔ یہ فون کس کا آ گیا؟" آئی جی بولے۔

" آپ سنیں ہی نہ۔ ریسیور اٹھا کر میز پر رکھ دیں۔" انسپکٹر
جمشید منہ بنا کر بولے۔

" نہیں جمشید۔ یہاں فون آنا۔ وہ بھی ان ہدایات کے
باوجود۔ کوئی معمولی بات نہیں۔ ضرور کسی بہت اہم آدمی نے
فون کیا ہے۔ اور بہت مجبور ہو کر۔ تمہاری تفتیش میں رکاوٹ
تو ضرور پڑے گی، لیکن کیا کیا جائے۔"

" جی بہتر۔ تو پھر آپ پہلے فون سن لیں۔"

" شکریہ جمشید۔" انھوں نے کہا اور ریسیور اٹھا لیا۔ اور پھر
دوسری طرف کی آواز سن کر وہ چونک اٹھے اور سیدھے ہو کر بیٹھ

گئے:

"یس سر!" انھوں نے فوراً کہا اور دوسری طرف کی بات سننے لگے۔ سب کی نظریں ان پر جمی تھیں، پھر ان کی پیشانی پر بل پڑتے نظر آئے۔ آخر انھوں نے یہ کہہ کر ریسیور رکھ دیا:

"بہت بہتر سر۔ آپ کی ہدایات پر عمل کیا جائے گا۔"

ریسیور رکھنے کے بعد چند سیکنڈ تک وہ ساکت بیٹھے رہے، ان کی نظریں فون کو گھورتی رہیں، آخر انھوں نے نظریں اٹھائیں اور انسپکٹر جمشید سے بولے:

"جمشید۔ تمھارے لیے ایک پیغام ہے۔"

"جی میرے لیے۔ لیکن میرے لیے پیغام بھلا کس طرح آ گیا۔ پیغام دینے والا فون کرنے میں کس طرح کامیاب ہو گیا۔" انھوں نے حیرت زدہ انداز میں کہا۔

"پیغام دینے والے نے ایک بہت عجیب طریقہ اختیار کیا ہے۔ خیر میں وضاحت کیے دیتا ہوں۔ فون صدر صاحب کا تھا۔"

"اوہ!" ان سب کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

"انھوں نے فرمایا ہے کہ وہ بہت مجبور ہو کر فون کر رہے ہیں۔"

"لیکن کیوں۔ انھیں کیا مجبوری پیش آ گئی۔"

"یہ مجبوری تمھاری بیگم کی پیدا کردہ ہے۔ انھوں نے پہلے تو براہِ راست تمھیں فون کرنا چاہا، لیکن جب دال نہ گلی تو صدر صاحب سے رابطہ قائم کیا۔"

"اور۔ انھوں نے ایسا کیوں کیا؟" انسپکٹر جمشید پریشان ہو گئے۔

"محمود، فاروق اور فرزانہ پُر اسرار انداز میں غائب ہو گئے ہیں۔ غائب ہونے سے پہلے انھوں نے کوئی سُراغ بھی نہیں چھوڑا۔ جب کہ وہ گھر سے نہایت اطمینان کی حالت میں رخصت ہوئے۔"

"اوہ!" ان کے منہ سے نکلا۔ پیشانی پر بل پڑ گئے۔

"صدر صاحب نے تمھارے لیے خصوصی اجازت دی ہے کہ اگر تم ان کی تلاش میں جانا چاہو تو جا سکتے ہو۔"

"کیسے جا سکتا ہوں سر۔ آپ مجھے اس معاملے کی تفتیش سونپ چکے ہیں۔"

"ہاں، لیکن اس کے باوجود تم جا سکتے ہو، کیونکہ صدر صاحب نے فرمایا ہے کہ محمود، فاروق اور فرزانہ بھی ملک کے لیے بہت اہم ہیں۔"

"نہیں سر۔ میں نہیں جاؤں گا۔ میں یہیں رہوں گا۔ اللہ مالک ہے۔" انھوں نے جواب دیا۔

"جیسے تمھاری مرضی ۔" انھوں نے کہا۔
"اور اب میں پھر اپنی تفتیش کی طرف آتا ہوں ۔" یہ کہہ کر وہ پھر کے ایم جاوودانی کی طرف مڑے اور دوسرے ہی لمحے انھیں یاد آیا ۔ وہ یک دم چونکے تھے ۔ ان کی نظریں کے ایم جاوودانی کے ساتھ بیٹھے ہوئے آفیسر پر پڑ گئیں ۔

"مسٹر حمید رضوانی ۔ آپ ۔ آپ کے چہرے پر اس قدر گھبراہٹ کیوں نظر آ رہی ہے۔"
"م ۔ میں نہیں جانتا ۔ بس میرا دل گھبرا رہا ہے۔"
"آپ ہمارے محکمے میں کلیریکل سٹاف کے انچارج ہیں نا۔"
"جی ہاں ۔" اس نے کہا۔
"کیا اس غداری سے آپ کا کوئی تعلق ہے؟"
"نن ۔ نہیں ۔ بالکل نہیں ۔"
"تو پھر ۔ کیا بات ہے ۔ آپ کے چہرے پر پسینہ کیوں ہے؟"
"شش ۔ شاید ۔ میں گرمی محسوس کر رہا ہوں ۔"
"کیا کہہ رہے ہیں ۔ کمرہ ایر کنڈیشنڈ ہے ۔"
"ہاں ، لیکن اس کے باوجود میں گرمی محسوس کر رہا ہوں ۔ کیا میں تھوڑی دیر کے لیے باہر جا سکتا ہوں ۔"
"افسوس ۔ یہ ممکن نہیں ۔" انھوں نے کہا ، پھر جلدی سے بولے :
"آپ اس سیٹ پر کب آئے تھے ۔ پہلے آپ شاید ہیڈ کلرک

تھے ۔"
"ج ۔ جی ہاں ۔ مجھے قریب قریب چار سال ہو گئے ہیں ۔"
انسپکٹر جمشید نے حمید رضوانی کے بائیں طرف بیٹھے ہوئے آفیسر کی طرف دیکھا :
"آپ مکرم جاوید ہیں ۔ ٹیلی پرنٹرز سیکشن کے انچارج ۔ رضوانی صاحب کی طبیعت میں فرق آپ کب سے محسوس کر رہے ہیں ۔ وزیرِ خارجہ صاحب کا پیغام سننے سے پہلے یا بعد میں ۔"
"بعد میں ۔" مکرم جاوید بولا۔
"گویا ان کی حالت پیغام سننے کے بعد خراب ہوئی ، اس سے پہلے یہ بالکل ٹھیک ٹھاک تھے ۔"
"جی ہاں ! بالکل یہی بات ہے ۔"
"اوہ ۔ لیکن آپ نے ہماری توجہ اس طرف کیوں نہ دلائی ۔"
"م ۔ میں نے مناسب نہیں سمجھا تھا ۔"
اسی وقت کوئی دھڑام سے گرا ، ساتھ ہی کے ایم جاوودانی چیخا :
"ارے ارے ۔ سنبھلیے جناب ۔"
وہ تیزی سے مڑے ۔ حمید رضوانی کرسی سے نیچے گر پڑا تھا اور کے ایم جاوودانی جھکے اسے اٹھانے کی کوشش میں مصروف تھے ۔ لیکن وہ اپنی کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکے ۔

"یہ۔۔یہ بہت بھاری ہیں۔ مجھ سے نہیں اُٹھ رہے۔" کے ایم جاوِدانی نے گھبرا کر کہا۔

اب محرم جاوید نے اس کی مدد کی اور دونوں نے حمید رضوانی کو اٹھا کر کرسی پر بٹھانا چاہا۔ لیکن۔ یہ کیا۔ وہ تھرا اُٹھے۔ اس کے ہونٹوں کے ایک طرف سے خون کی ایک باریک سی لکیر نکل رہی تھی۔ آنکھیں پتھرا چکی تھیں اور ہاتھ مُردوں کی طرح لٹک رہے تھے۔

"ارے۔ یہ کیا ہوا؟" انسپکٹر جمشید چلا اُٹھے اور تیزی سے اس کی طرف لپکے۔ دوسرے ہی لمحے ان کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

حمید رضوانی مر چکا تھا۔۔۔

انوکھی مہم

ان کی آنکھ کھلی تو ایک شاندار کمرے میں تھے:

"بھئی واہ! یہ کمرہ تو کسی بادشاہ کا کمرہ جان پڑتا ہے۔" محمود نے خوش ہو کر کہا۔

"ہم بھی تو شہزادوں سے کم نہیں۔" فاروق نے منہ بنایا۔

"بھئی ہر وقت جلتے بھنتے نہ رہا کرو۔۔۔ رنگ کالا ہو جائے گا۔۔ اللہ تعالیٰ نے اتنا شاندار کمرہ عنایت فرمایا ہے۔" فرزانہ نے کہا۔

"ہوں۔ بات تو ٹھیک ہے، لیکن ہم ہیں کہاں؟" محمود بولا۔

"شاید جنت میں۔" فاروق بولا۔

"جنت کے کمرے ایسے ہوتے ہیں۔" فرزانہ حیران ہو کر بولی۔

"تو پھر کیسے ہوتے ہیں، تم تو اس طرح کہہ رہی ہو جیسے پہلے بھی کئی بار جنت کی سیر کر چکی ہو" فاروق مسکرایا۔

"پتا نہیں کیسے ہوتے ہوں گے۔ انھیں تو آدمی مرنے کے بعد ہی دیکھ سکے گا۔ ہاں زندگی میں اگر جنت، اور دوزخ کسی

نے دیکھی ہے تو زمانے کے آخری نبی ہمارے آقا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے۔ اور یہ ان کا سب سے بڑا معجزہ ہے۔"

"واقعی — اس میں کیا شک ہے۔ اور پھر آپ نے یہ سب خواب میں نہیں — جسمانی حالت میں آسمانوں پر جا کر دیکھا — اللہ اکبر۔"

عین اسی وقت دروازہ کھل گیا، لیکن سامنے کوئی بھی نہ آیا:

"یہ — یہ دروازہ کس نے کھولا ہے" فرزانہ ہکلائی۔

"کسی جن بھوت نے کھولا ہے، کیونکہ اس طرح تو جن بھوت ہی کھولا کرتے ہیں۔" فاروق نے گھبرا کر کہا۔

"تم تو اس طرح کہہ رہے ہو جیسے جنوں اور بھوتوں کو دروازے کھولتے دیکھتے رہے ہو۔ اور جیسے انہیں دروازے کھولنے کے سوا اور کوئی کام ہی نہ ہو۔"

"اور تم شاید میرے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئی ہو۔ کچھ تو خدا کا خوف کرو۔"

"ارے بھئی — کون ہے — کس نے دروازہ کھولا ہے — کیوں ہمیں تنگ کر رہے ہو — بڑی مشکل سے تو ایسی شاندار جگہ تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔" محمود نے ہانک لگانے کے انداز میں کہا —

"بھئی جھوٹ تو نہ بولو۔" فاروق نے فوراً کہا۔

"کیا مطلب — میں نے کیا جھوٹ بولا۔" محمود حیران رہ گیا۔

"تم نے کہا ہے نا — بڑی مشکل سے تو یہاں تک پہنچے ہیں۔"

"ہاں ہاں — بالکل — تو اس میں جھوٹ کیا ہوا۔" محمود بولا۔

"ہم بڑی مشکل سے نہیں — بڑی آسانی سے یہاں پہنچے ہیں — کرنا ہی کیا پڑا ہے — وہ رقعہ پڑھا اور گھر سے نکل آئے — موٹر سائیکلوں پر بیٹھ کر جنگل تک پہنچے اور سرخ کار میں بیٹھ گئے — اس کے بعد ہم نے صرف اتنا کیا تھا کہ کار کے شیشے چڑھائے تھے — اور بس — پھر ہم خود بخود یہاں پہنچ گئے — ذرا بھی جو ہاتھ پیر ہلائے ہوں۔" فاروق کہتا چلا گیا۔

"اچھا بابا — یونہی سہی — بال کی کھال نہ اتارا کرو ہر وقت۔" محمود نے جھلا کر کہا۔

"پہلے تم یہ ثابت کرو کہ بال کی کھال ہوتی ہے۔"

"مجھے ثابت کرنے کی ضرورت نہیں، محاورہ خود ثبوت دے رہا ہے۔" محمود مسکرایا۔

"لیکن محاورہ تو انسان نے بنایا ہے — انسان سے ہی ثبوت مانگا جا رہا ہے۔" فاروق بھی مسکرایا۔

"وحشت تیرے کی — تو یہ ہے تم سے۔" محمود نے جھلا کر ران

پر ہاتھ مارا۔

"میرا خیال ہے، دروازہ خود بخود کھلا ہے۔ آؤ باہر نکل کر دیکھیں ہم کہاں ہیں" فرزانہ نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ انھیں نرم گرم بستروں پر نہیں، فرش پر لٹایا گیا تھا، کمرے میں بستر تو کیا۔ کوئی چیز بھی نہیں تھی — ہاں کمرہ شاندار ضرور تھا۔

"لو — اب دروازے خود بخود کھلنے لگے — کل کو کہیں گے، ہم خود بخود چلتے ہیں" فاروق نے منہ بنایا۔

"اس میں کیا شک ہے — ہم خود بخود ہی تو چلتے ہیں" محمود نے فوراً کہا۔

"اچھا تم دونوں یہیں باتیں گھڑو — میں ذرا باہر کا چکر لگا آؤں"

"واہ — اس سے اچھی ترکیب تو کوئی ہو ہی نہیں سکتی — اب تو مجھے بھی یقین آ چلا ہے کہ تم نے ترکیبیں بتانے کا ٹھیکا لے رکھا ہے" فاروق نے خوش ہو کر کہا۔

فرزانہ نے اسے کھا جانے والی نظروں سے گھورا اور پھر کمرے سے نکل گئی، وہ بھی اٹھے، اس سے پہلے کہ باہر نکلتے، انھوں نے فرزانہ کی آواز سنی:

"ارے — یہ کیا — یہ — بالکل بند"

"بالکل بند کیا؟" محمود نے فوراً پوچھا۔

"آؤ دیکھ لو۔ آؤ —" فرزانہ نے ڈرے ڈرے انداز میں کہا۔

دونوں جلدی سے باہر نکلے اور پھر دھک سے رہ گئے — وہ ایک بڑا اور پرانا مکان تھا، لیکن اسے کسی بہت دولت مند آدمی نے بنوایا تھا، ہر چیز بہت مضبوط بنوائی گئی تھی — لیکن اس وقت انھیں جس نے چونکایا تھا، وہ دروازے، کھڑکیاں اور روشندان تھے — یہ سب کے سب بند تھے — اور بند بھی عام حالات میں نہیں، خاص حالات میں — تمام دروازوں، کھڑکیوں اور روشندانوں پر لکڑیوں کے موٹے موٹے تختے جڑ دیے گئے تھے — اور انھیں جڑنے کے لیے موٹی کیلیں استعمال کی گئی تھیں —

"یہ کیا ہے بھئی" فرزانہ بوکھلا کر بولی۔

"ہم — مقبرہ" فاروق کے منہ سے نکلا۔

"لیکن ہم تو زندہ ہیں — مقبروں میں تو مُردوں کو دفن کیا جاتا ہے" محمود نے اسے گھورا۔

"تو کیا ہے — چند دن بعد ہم بھی مُردوں میں شمار ہونے لگیں گے، کیونکہ باہر نکلنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آیا — اور نہ مکان کے اندر کوئی ایسی چیز موجود ہو گی جس کی مدد سے ہم دروازہ کھولنے کی کوشش کر سکیں" فاروق نے جلدی جلدی کہا۔

"یہ — یہ — تم کس طرح کہہ سکتے ہو" فرزانہ ہکلائی۔

"اس طرح کہ آثار یہی کہہ رہے ہیں، جس کمرے میں ہمیں

ڈالا گیا۔ اس میں بھی فرنیچر یا کسی اور چیز کا نام نہیں۔ آؤ باقی حصوں کو بھی دیکھ لیں۔"

انھوں نے ایک ایک کمرے کو دیکھا، مکان میں چاروں طرف کمرے تھے۔ درمیان میں صحن تھا۔ صحن کے اوپر آسمان نظر آ رہا تھا، لیکن چھت بہت اُونچی تھی۔ ایک طرف زینہ تھا۔ وُہ بے تحاشہ انداز میں سیڑھیاں چڑھتے چلے گئے۔ لیکن زینے کا دروازہ بھی لکڑی کے تختوں سے جڑ دیا گیا تھا۔ گویا وُہ مکان کی چھت پر بھی نہیں جا سکتے تھے۔

"یہ۔ یہ تو واقعی مقبرہ ہے۔ ہمارا مقبرہ۔" محمود بڑبڑایا۔

"عقل اور ہوش کو بحال رکھو۔ گھبرانے اور بوکھلانے سے کچھ نہیں ہو گا۔ غور طلب بات یہ ہے کہ دروازے ہمیں یہاں لانے سے پہلے جڑے گئے یا بعد میں۔ میرا خیال ہے، یہ انتظام پہلے ہی کر لیا گیا تھا، اس کے بعد ہمیں یہاں لایا گیا۔ لانے والے ہمیں اس کمرے میں ڈال کر آخر باہر نکلے ہوں گے۔ سوال یہ ہے کہ وہ باہر کس طرح نکلے۔" فرزانہ نے پُر سکون اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"اوہ۔ اس کا مطلب ہے۔ اس کا مطلب ہے۔" فاروق کہتے کہتے رُک گیا۔

"ہاں، بس اس کا مطلب یہی ہے کہ اس کا مطلب ہے۔" فرزانہ

نے جل کر کہا۔

"اس کا مطلب ہے۔ مکان سے باہر نکلنے کا کوئی خفیہ راستہ بھی موجود ہے۔ یا پھر کم از کم ایک دروازہ یا کھڑکی ایسی ضرور ہے جس میں تختے اس طرف سے نہیں، باہر کی طرف سے جڑے گئے ہوں گے۔ اگر اس مکان میں کوئی خفیہ دروازہ موجود ہے، تب تو کوئی بات نہیں، ہم خفیہ دروازے تلاش کرنے کے ماہر ہیں، لیکن اگر کوئی دروازہ باہر سے جڑا گیا ہے تو پھر ہم مارے گئے۔"

"ابھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ہم مارے گئے۔ پہلے ایک ایک دروازہ اور کھڑکی دیکھ لیں۔"

انھوں نے تفصیلی جائزہ شروع کیا۔ اور پھر ان پر اوس پڑ گئی۔ ایک کمرے کی کھڑکی میں انہیں تختے جڑے ہوئے نظر نہیں آئے تھے۔ اسے کھولنے کی کوشش کی تو وُہ اپنی جگہ سے ہلی تک نہیں۔

"بس ثابت ہو گیا۔ اس مکان کو ہمارے لیے واقعی مقبرہ بنا دیا گیا ہے۔ اس سے باہر نکلنے کا کوئی خفیہ دروازہ نہیں ہے۔ ہمیں یہاں لانے والے اس کھڑکی کے ذریعے باہر نکلے تھے اور جاتے وقت انھوں نے باہر سے اسے جڑ دیا۔" محمود بولا۔

"خیر۔ مایوسی گناہ ہے۔ ابھی ہم نے اس مکان کا جائزہ

نہیں لیا کہ ہم باہر کس طرح نکل سکتے ہیں ، اس سلسلے میں جو بات میرے ذہن میں بُری طرح کھٹک رہی ہے ۔ وہ یہ ہے کہ جس کمرے میں ہمیں ڈالا گیا تھا ۔ ہمارے ہوش میں آنے کے بعد اس کا دروازہ خود بخود کیوں کُھلا تھا ۔ یہاں تو ایسی ہُوا بھی نہیں چل رہی ۔ تمام دروازے تو بند ہیں ، ہُوا چلے بھی کس طرح ۔"

" ہاں ۔ بے چاری ہُوا کو بھی ہمارے ساتھ قید کر دیا گیا ہے۔" فارُوق نے افسوس زدہ انداز میں کہا۔

" ہوں ۔ ٹھیک ہے ۔ پہلے ہم اسی کمرے کا جائزہ لیں گے ، جس کمرے میں ہمیں رکھا گیا ۔ آؤ ۔"

وُہ تیز تیز چلتے اس کمرے کی طرف آئے ۔ دروازے کا بغور جائزہ لیا اور پھر فرزانہ کے منہ سے بے ساختہ ارے نکل گیا :

" خدا کا شکر ہے ۔ ان حالات میں بھی کسی ارے صاحب سے ملاقات تو ہوئی ۔ اب جلدی سے اس کی وضاحت کر دو۔" فاروق نے خوش ہو کر کہا۔

" دروازے کے نچلے حصے میں ایک میخ ٹھونکی گئی ہے ۔ اس میخ سے دھاگا بندھا ہے ۔ مضبوط دھاگا ۔ ارے ۔ یہ تو شاید بیرونی دروازے کی طرف جا رہا ہے ۔ شاید اس لیے کہ ہمیں نہیں معلوم ۔ بیرونی دروازہ کون سا ہے ۔" فرزانہ نے پُرجوش

انداز میں کہا۔

وُہ دھاگے کے ساتھ ساتھ چلتے دوسرے دروازے تک آئے ، انھوں نے دیکھا ، دھاگے کا دوسرا سرا ایک دروازے کے نیچے سے ہوتا باہر چلا گیا تھا :

" اوہ ۔ میں سمجھ گئی ۔ اس دھاگے کو کھینچ کر دروازہ کھولا گیا ہے ۔"

" لیکن اس کی ضرورت کیا تھی ؟" محمود بڑبڑایا۔

" ہمیں یہ بتانا کہ اب ہم اس مکان میں بُری طرح قید ہیں ۔ اس بُری طرح کہ نکلنے کی کوشش بھی نہیں کر سکتے۔" فاروق بولا۔

" ہوں ۔ یہ بات تو خیر ٹھیک ہے ۔ تب پھر اس کا مطلب ہے ، وُہ لوگ شاید اب بھی دروازے کے دوسری طرف موجود ہیں۔" محمود نے پُرخیال لہجے میں کہا۔

" یہ ضروری نہیں ۔ ٹھہرو ۔ میں دھاگا کھینچ کر دیکھتی ہوں۔" یہ کہہ کر فرزانہ فرش پر بیٹھ گئی اور دھاگے کو آہستہ آہستہ کھینچنا شروع کر دیا ۔ یہاں تک کہ دوسرا سرا اس کے ہاتھ میں آ گیا ۔

" وہ لوگ جا چکے ہیں ، ہمیں موت کے حوالے کرنے کے بعد وُہ دروازے کے باہر رہ کر کیا کرتے۔" فرزانہ نے منہ بنایا۔

" اب ہم کیا کریں ۔ ہم ہاتھوں کی مدد سے ان تختوں کو تو

اکھاڑ نہیں سکتے — پورے مکان میں کوئی ایسی چیز نہیں جس کی مدد
سے ہم لکڑی کے تختے اکھاڑنے کی کوشش کر سکیں۔" فاروق نے
جلدی جلدی کہا۔

"ہاں، تم ٹھیک کہتے ہو — لیکن لے دے کے ہمارے پاس
ایک چیز ضرور موجود ہے۔" محمود نے پُر اسرار انداز میں کہا۔

"چلو خیر — لے دے کے ہی سہی — ہے تو سہی — سوال یہ
ہے کہ وہ کیا چیز ہے؟" فاروق نے پوچھا۔

"ہم — میرا چاقو۔"

"ارے — واہ — اتنی کام کی چیز کو تو ہم بھول ہی گئے —
دھت تیرے کی۔" فرزانہ پُر جوش انداز میں بولی۔

محمود نے تیزی سے جھک کر ایڑی کھسکائی اور پھر دھک سے
رہ گیا — ایڑی میں چاقو نہیں تھا —

○

ان کی کار پر فائر بے آواز پستول سے کیا گیا تھا، لیکن
خان رحمان بھانپ گئے تھے؛ تاہم دوسرا فائر نہیں ہوا — ایک
نیلے رنگ کی کار تیزی سے ان کے پاس سے نکل کر ہوا ہو
گئی — دیکھتے ہی دیکھتے کار نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

"پروفیسر صاحب — آپ اس کے تعاقب میں روانہ ہو جائیں —
میں ٹائر تبدیل کر کے آتا ہوں۔"

"اچھی بات ہے۔" انھوں نے کہا اور اپنی کار نیلی کار کے پیچھے
لگا دی — اس کے ساتھ کار میں شائستہ اور بیگم جمشید تھیں۔

"ابا جان — اور تیز چلیے — کہیں وہ نکل نہ جائے۔" شائستہ
چلائی —

"اچھا بیٹی، لیکن سن لو — زندگی میں شاید پہلی بار قانون کی
خلاف ورزی کر رہا ہوں — اس سے پہلے میں نے کبھی کار مقررہ رفتار
سے تیز نہیں چلائی ہو گی۔"

"کیا کیا جائے — ابا جان مجبوری ہے — یہ محمود، فاروق اور
فرزانہ کا معاملہ ہے — کیوں آنٹی؟" شائستہ بولی۔

"ہاں بالکل — یہ تو ہے۔"

وہ رفتار بڑھائے چلے گئے — یہاں تک کہ نیلی کار نظر آنے
لگی:

"وہ مارا — آج تو ابا جان — آپ نے بھی کمال کر دیا۔"

"ارے باپ رے۔" پروفیسر داؤد گھبرا کر بولے۔

"کیوں کیا ہوا؟" بیگم جمشید گھبرا گئیں۔

"ہم — میں سوچ رہا ہوں — یہ کمال مجھ سے کس طرح ہو
گیا۔" انھوں نے گھبرائے ہوئے انداز میں کہا۔

شائستہ اور بیگم جمشید مسکرا پڑیں ــــ

"بس اس کے پیچھے لگائے رکھیے ــ یہاں تک کہ خان رحمان بھی آ جائیں" بیگم جمشید بولیں۔

"ٹھیک ــ لیکن ــ نیلی کار سے پھر فائرنگ شروع ہو سکتی ہے"۔

"درمیانی فاصلہ کم نہ ہونے دیں ــ اتنا فاصلہ رکھیں کہ وہ آسانی سے فائر نہ کر سکے"۔

"اچھی بات ہے"۔

تعاقب جاری رہا اور پھر انھوں نے خان رحمان کی کار آتے دیکھی ــ یہاں تک کہ وہ ان کے برابر آ گئے:

"کیا حالات ہیں" وہ بولے۔

"ہم اب تک نہایت کامیابی سے تعاقب کرتے رہے ہیں ــ آپ کا انتظار تھا ــ اب آپ جو کہیں" بیگم جمشید بولیں۔

"میں اس سے آگے نکلنے کی کوشش کرتا ہوں ــ پھر ہم سڑک روک لیں گے" خان رحمان بولے

"بالکل ٹھیک ــــ بہت اچھی ترکیب ہے" شائستہ تالی بجا کر بولی۔

خان رحمان نے جونہی اپنی کار کی رفتار بڑھائی ــ نیلی کار کی رفتار بھی تیز ہو گئی ــ ان کی پیشانی پر بل پڑ گئے ــ ساتھ ہی غصہ بھی آ گیا ــ اور پھر انھوں نے تیز رفتاری کی انتہا کر دی۔ اگلی کار کو راستہ دیتے ہی بن پڑی ــ اس کے آگے نکلتے ہی

خان رحمان نے کار کو آڑا کر دیا اور روک لیا ــ نیلی کار کے بریک زور سے چرچرائے ــ اور پھر وہ رک گئی ــ پروفیسر داؤد نے بھی کار کو آڑا کر کے روک دیا۔ لیکن نہ وہ کار سے اترے اور نہ خان رحمان، کیونکہ جانتے تھے ــ نیلی کار والے کے پاس پستول ہے ــ آخر نیلی کار میں سے ایک سر باہر نکلا اور چیختی آواز ان کے کانوں سے ٹکرائی:

"کیا یہ سڑک آپ لوگوں کی ذاتی سڑک ہے"۔ آواز زنانہ تھی۔

"جی نہیں، لیکن آپ کی کار سے ہماری کاروں پر فائر کیا گیا ہے، اس لیے آپ کو روکا گیا ہے اور میرا خیال ہے، ایسا کرنا قانون کے عین مطابق ہے" خان رحمان نے کار سے اترتے ہوئے کہا ــ

"کیا کہا ــ میری کار سے آپ کی کار پر فائر کیا گیا ــ آپ لوگ ضرور غلط فہمی میں مبتلا ہیں"۔

"جی نہیں ــ آپ کو تلاشی دینا ہو گی ــ تلاشی پر اگر آپ کے پاس سے یا کار میں سے کوئی پستول برآمد نہ ہوا تو آپ جا سکتی ہیں"۔

"خیر ــ یونہی سہی ــ مجھے کوئی اعتراض نہیں، کیونکہ میں نہیں چاہتی، وقت ضائع ہو" اس نے کہا۔

بیگم جمشید نے اس کی تلاشی لی، خان رحمان نے کار کو

اچھی طرح دیکھا بھالا، لیکن پستول برآمد نہ کر سکے۔ آخر مایوس ہو گئے۔

"آپ کا نام کیا ہے؟" خان رحمان نے پوچھا۔

"روشنی منیر۔" اس نے کہا۔

خان رحمان نے نام اور کار کے نمبر نوٹ کر لیے اور بولے:

"اپنا پتا بھی لکھوا دیں۔"

"اس کی کیا ضرورت ہے۔"

"اگر آپ مجرم نہیں ہیں۔ تو پتا بتانے سے کیوں ڈر رہی ہیں۔" خان رحمان بولے۔

"میں ڈر نہیں رہی۔" اس نے جھنا کر کہا، پھر بولی:

"لکھیے۔ ۱۰۱ نیو بخاری ٹاؤن۔"

"پروفیسر صاحب۔ کار کے خانے میں سے کاغذات نکال کر دیکھیں، ان کا نام اور پتا یہی ہے۔" خان رحمان بولے۔

"کاغذات میں آپ کو یہ نام اور پتا نظر نہیں آئے گا۔" لڑکی جلدی سے بولی۔

"کیوں؟" خان رحمان نے اسے گھورا۔

"اس لیے کہ یہ کار میری ایک سہیلی کی ہے۔"

"اچھا خیر۔ ہم اس سہیلی کا نام اور پتا نوٹ کر لیتے ہیں۔"

اتنے میں پروفیسر صاحب کاغذات نکال چکے تھے۔ انھوں

نے کھول کر دیکھے۔ کار کسی نجمہ نورین کی تھی۔ پتا تھا، ۱۲ گرین روڈ۔

"ٹھیک ہے۔ اب آپ جا سکتی ہیں، لیکن جانے سے پہلے یہ بتا دیجیے۔ آپ اس طرف کہاں جا رہی ہیں، کیونکہ نہ تو اس طرف گرین روڈ ہے اور نہ نیو بخاری ٹاؤن۔"

"میں سیر کی غرض سے نکلی تھی۔ مجھے کار چلانے کا بہت شوق ہے۔ کچھ دور جا کر لوٹ آؤں گی۔"

"ٹھیک ہے۔ آپ جا سکتی ہیں۔ اُمید ہے، معاف فرمائیں گی۔"

"آپ لوگوں نے مجھے بلا وجہ پریشان کیا ہے، معاف کس طرح کر سکتی ہوں۔" اس نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"کیا مطلب؟" خان رحمان چونک اٹھے۔

"میں نے بھی آپ کی کاروں کے نمبر نوٹ کر لیے ہیں اور میں جا کر پولیس اسٹیشن میں آپ کے خلاف رپورٹ درج کراؤں گی۔"

"شاید آپ کو یقین نہیں آیا۔ میری ڈگی میں پستول کی گولی سے پھٹنے والا ٹائر موجود ہے۔ دیکھ لیں۔"

"شکریہ! میں کیا کروں گی دیکھ کر، پولیس کو دکھائیے گا۔"

"ہوں۔ ٹھیک ہے، لیکن میرا خیال ہے، اس کا کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔"

"یہ میں جانوں۔ میرا کام جانے۔" اس نے اکڑ کر کہا اور پھر راستہ ملتے ہی ہوا ہو گئی۔

"یہ تو کچھ بھی نہ ہوا۔" بیگم جمشید بڑبڑائیں۔

"کوئی بات نہیں — ہم تو بس محمود، فاروق اور فرزانہ کو تلاش کر لینا چاہتے ہیں — آؤ واپس چلیں — اور ایک ایک سڑک کو چھان ماریں۔" خان رحمان بولے:

وہ کاروں کی طرف مڑے ہی تھے کہ بیگم جمشید چونک کر مڑیں اور پھر چلا اٹھیں:

"اوہ — وہ ہمیں دھوکا دے گئی۔"

"دھوکا دے گئی — وہ کیسے؟"

"وہ دیکھیے — سڑک سے نیچے درختوں کے جھنڈ میں کیا چیز چمک رہی ہے۔"

ان سب نے اس سمت میں دیکھا اور پھر دوڑ کر جھنڈ تک پہنچے — ان کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں، جھنڈ میں سیاہ رنگ کا ایک بڑا سا پستول پڑا تھا، اس پر سائیلنسر بھی فٹ تھا۔

"اوہ — اوہ۔" پروفیسر داؤد بولے۔

"وہ ابھی زیادہ دور نہیں گئی ہو گی۔ ہم اب بھی اسے پکڑ سکتے ہیں۔" خان رحمان چلا اٹھے اور اپنی کار کی طرف دوڑے، حامد، سرور اور ناز بھی ان کے پیچھے دوڑ پڑے، لیکن اس سے پہلے کہ ان میں سے کوئی کار میں داخل ہو سکتا، وہ کار سٹارٹ کر چکے تھے۔ ان کے دیکھتے ہی دیکھتے کار دور جا چکی تھی —

"اب ہم سب اس کار میں کس طرح بیٹھیں۔" بیگم جمشید بولیں۔

"ہمیں ان کے پیچھے جانے کی ضرورت بھی کیا ہے — یہیں رک کر ان کا انتظار کیوں نہ کریں۔"

"ہاں! یہ ٹھیک رہے گا۔" بیگم جمشید نے کہا اور پھر پستول کی طرف قدم اٹھانے لگیں — ایک رومال کے ذریعے اسے نالی کی طرف سے پکڑ کر کار کے خانے میں رکھنے کے بعد بولیں:

"اس جملے سے تو صاف ظاہر ہے، محمود، فاروق اور فرزانہ بھی مصیبت میں پھنس چکے ہیں۔"

"فکر نہ کریں بھابی — اللہ پر بھروسہ رکھیں — محمود، فاروق اور فرزانہ کوئی تر نوالہ نہیں ہیں۔"

وہ انتظار کرتے رہے — کوئی کھڑا رہا، کوئی کار میں بیٹھ گیا اور کوئی درخت کے سائے میں چلا گیا — آخر آدھ گھنٹے بعد انہیں انسپکٹر جمشید کی کار آتی دکھائی دی —

معمولی سی چیز

"اُف خُدا! یہ تو مر چکے ہیں۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"نہیں!!!" کمرے میں کئی آوازیں گونج اُٹھیں۔

اور پھر سب کے سب اُٹھ کھڑے ہوئے — کرسیاں گھسٹنے کی آوازیں گونج اُٹھیں:

"مہربانی فرما کر سب لوگ اپنی اپنی جگہ پر موجود رہیں۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

اب انھوں نے کے ایم جاودانی اور مکرم جاوید کی مدد سے حمید رضوانی کو دیوار کے ساتھ فرش پر لٹا دیا — اب انھوں نے اس کی نبض ٹٹولی — دل کی دھڑکن دیکھی اور سیدھے ہوتے ہوئے بولے:

"اس میں شک نہیں کہ یہ مر چکے ہیں، لیکن منہ سے اس طرح خون نکلنا مجھے پریشان کر رہا ہے — سر — کیا آپ یہاں ڈاکٹر صاحب کو بلانے کی اجازت دیں گے؟"

"ہاں! ان حالات میں اجازت دینا ہی ہو گی۔"

"ٹھیک ہے۔" یہ کہہ کر انسپکٹر جمشید نے ڈاکٹر انصاری کو فون کیا — چند منٹ بعد ہی وہ پہنچ گئے اور لاش کا معائنہ شروع کیا، پھر خوف زدہ انداز میں پیچھے ہٹتے ہوئے بولے:

"انھیں تو زہر دیا گیا ہے۔"

"جی — کیا فرمایا — زہر۔"

"جی ہاں! ان کی موت زہر سے ہوئی ہے، اس میں کوئی شک نہیں۔"

"اور یہ زہر انھیں کب دیا گیا؟"

"علامات بتا رہی ہیں — زہر مہلک تھا، صرف چند منٹ میں اس زہر نے ان کی جان لے لی، مطلب یہ کہ زہر چند منٹ پہلے ہی دیا گیا۔"

"لیکن ڈاکٹر صاحب — ابھی تو میٹنگ میں موجود حضرات نے کوئی چیز بھی نہیں کھائی، یہاں تک کہ کسی نے پانی کے گلاس کو ہاتھ بھی نہیں لگایا۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"زہر کسی سوئی کے ذریعے بھی جسم میں داخل کیا جا سکتا تھا۔" ڈاکٹر صاحب بولے۔

"اوہ ہاں — اس کا امکان ہے۔"

یہ کہتے وقت انھوں نے پہلے تو کے ایم جاودانی کی طرف

دیکھا اور پھر مکرم جاوید کی طرف، کیونکہ حمید رضوانی کے دائیں اور بائیں یہی دونوں تھے:

"کیا مطلب۔ آپ ہمیں اس طرح کیوں گھور رہے ہیں؟" مکرم جاوید نے گھبرا کر کہا۔

"مقتول کے دائیں اور بائیں آپ دونوں ہی تو تھے۔ آپ کو نہ گھوروں تو کسے گھوروں؟"

"یہ۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" کے ایم جاودانی نے تھرا کر کہا۔

"خیر۔ ابھی معلوم ہو جاتا ہے کہ آپ میں سے ان کے جسم میں زہر کس نے اُتارا۔" انسپکٹر جمشید سرد آواز میں بولے۔

"کیا مطلب۔ یہ بات آپ کس طرح معلوم کریں گے؟" مکرم جاوید پریشان ہو گیا۔

"کے ایم جاودانی دائیں طرف تھے اور آپ بائیں طرف۔ زہر اگر حمید رضوانی کے جسم کے دائیں حصے سے داخل کیا گیا تو مجرم جاودانی صاحب، ورنہ آپ۔"

"اُف۔ آپ تو ہمیں مجرم بنانے پر تُل گئے ہیں۔" مکرم جاوید نے کانپ کر کہا۔

"اس میں میرا کیا قصور۔" وہ بولے اور ڈاکٹر انصاری کی طرف مڑے:

"ڈاکٹر صاحب۔ ان کے جسم کا بغور جائزہ لیں۔ اور معلوم کریں، سوئی کا نشان کہاں ہے۔ اور میں ان کی کرسی کے آس پاس سوئی کو تلاش کرتا ہوں۔"

کمرے میں سنسنی کی ایک لہر دوڑ چکی تھی۔ ہر کوئی بت بنا ہوا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنا کام شروع کیا اور انسپکٹر جمشید پنجوں کے بل جھک کر سوئی کو تلاش کرنے لگے۔ آخر ڈاکٹر صاحب کی آواز اُبھری:

"میرا خیال ٹھیک نکلا۔ یہ رہا سوئی کا نشان۔ بائیں بازو پر۔"

وہ تیزی سے اس طرف بڑھے اور پھر ان کی نظریں سوئی کے نشان پر جم گئیں۔ یہ بائیں ہاتھ کی پشت پر تھا۔

"کیا آپ کو یقین ہے۔ زہر اسی جگہ سے جسم میں داخل ہوا ہے۔"

"جی ہاں! سو فیصد درست رپورٹ پوسٹ مارٹم کے بعد دی جا سکے گی۔"

"شکریہ۔ ابھی پوسٹ مارٹم کا وقت نہیں آیا۔" وہ بولے اور پھر سوئی کی تلاش میں نظریں دوڑانے لگے، لیکن سوئی کہیں بھی نظر نہ آئی۔ اب انھوں نے دروازے پر کھڑے تین سادہ لباس والوں میں سے دو کو اپنی طرف آنے کا اشارہ کیا اور بولے:

"کے ایم جاودانی صاحب اور مکرم جاوید صاحب کی تلاشی لو۔"

"میری تلاشی تو پہلے ہی لی جا چکی ہے۔" کے ایم جاودانی جلدی سے بولے۔

"وہ تلاشی اسلحے کے لیے لی گئی تھی۔ اس وقت سوئی کا خیال بھی ذہن میں نہیں تھا۔ اب ہم صرف سوئی تلاش کریں گے۔" انھوں نے کہا۔

کے ایم جاودانی منہ بنا کر رہ گئے۔ سادہ لباس والوں نے دونوں کی تلاشی لی۔ اور پھر الگ ہٹتے ہوئے بولے:

"ان کے پاس کوئی سوئی نہیں ہے۔"

"ان کے پاس کوئی سوئی نہیں ہے۔ فرش پر بھی کوئی سوئی نہیں ہے۔ تو پھر وہ سوئی کہاں گئی جس سے زہر جسم میں داخل کیا گیا ہے۔" انھوں نے حیران ہو کر کہا، پھر چونک کر بولے:

"ان دونوں حضرات کی کرسیوں کو اچھی طرح دیکھو۔"

انھوں نے کرسیوں کو بھی دیکھا، لیکن سوئی پھر بھی نہ ملی۔

"ڈاکٹر صاحب۔ زہر کسی اور چیز کے ذریعے تو جسم میں داخل نہیں کیا گیا۔"

"نہیں! سوئی کا نشان بالکل واضح ہے۔" وہ بولے۔

انسپکٹر جمشید چند لمحے تک پریشانی کے عالم میں کھڑے جاودانی اور مکرم کے چہروں کو دیکھتے رہے، ان کے چہروں پر ایک رنگ آ رہا تھا تو دوسرا جا رہا تھا۔ آخر وہ ایک بار پھر لاش کی طرف

مڑے اور اس کا معائنہ شروع کر دیا۔ لاش کے دائیں ہاتھ کی انگلی میں انھیں ایک انگوٹھی نظر آئی۔ جھک کر اس انگوٹھی کو غور سے دیکھا اور اس کے نگینے کے پاس ایک نوکیلا سا اُبھار نظر آیا، ان پر جوش کی حالت طاری ہو گئی:

"ڈاکٹر صاحب۔ یہ دیکھیے۔ کہیں وہ سوئی یہی تو نہیں۔" وہ بولے۔

ڈاکٹر انصاری انگوٹھی پر جھک گئے اور پھر بولے:

"اس کا امکان ہے۔"

"اوہ۔ تب تو اس کا فوری تجزیہ ہونا چاہیے۔"

یہ کہتے ہوئے انھوں نے انگوٹھی انگلی سے نکال لی۔ لیکن نوکیلے اُبھار سے بچنے کی کوشش کرتے ہوئے۔ انگوٹھی آسانی سے نکل آئی۔ فوراً ہی اسے ماہرین کے حوالے کر دیا گیا۔ اور لاش کو بھی پوسٹ مارٹم کے لیے بھیج دیا گیا۔

"اس حادثے سے کم از کم ایک بات ضرور ثابت ہو گئی اور وہ یہ کہ غدار ہمارے درمیان میں ہی موجود تھا۔" آئی جی بولے۔

"جی ہاں! بالکل۔" کئی آوازیں اُبھریں۔

"انگوٹھی ان کے دائیں ہاتھ میں تھی۔ سوئی کا نشان بائیں ہاتھ پر۔ اب اگر اس انگوٹھی پر زہر لگا ہوا ثابت ہو جاتا ہے تو حمید رضوانی مجرم ثابت ہو جاتے ہیں، لیکن افسوس! اب ہم انھیں

سزا نہیں دے سکیں گے" انسپکٹر جمشید بولے۔

" اس لیے کہ یہ خود ہی سزا دے چکا ہے اپنے آپ کو" ڈی آئی جی بولے۔

جلد ہی رپورٹ موصول ہو گئی۔ انگوٹھی کا اُبھار واقعی زہر آلود تھا:

" لیجیے۔ جناب مجرم حاضر ہے۔ اب جاودانی صاحب کے گھر کی بجائے حمید رضوانی کے گھر کی تلاشی لی جانی چاہیے"

" ہاں! ٹھیک ہے۔ جاودانی صاحب۔ اپنے گھر کے نمبر بتایئے، تاکہ تلاشی لینے والوں کو وہاں سے نکال کر دوسری طرف بھیجا جائے۔"

کے ایم جاودانی نے نمبر بتا دیے۔ اور آئی جی صاحب نے فون کر دیا۔

" اب یہ میٹنگ برخاست ہو جانی چاہیے، کیونکہ غدار اپنے انجام کو پہنچ چکا ہے" انسپکٹر جمشید بولے۔

" ہاں ٹھیک ہے۔ میں وزیرِ خارجہ صاحب اور صدرِ مملکت کو اِطلاع دیے دیتا ہوں۔ آپ حضرات اب تشریف لے جا سکتے ہیں۔ اور ہاں۔ جمشید تم فوری طور پر محمود، فاروق اور فرزانہ کی تلاش میں روانہ ہو جاؤ"

" جی بہتر۔ بہت بہت شکریہ۔ اب حمید رضوانی کے گھر سے

کاغذات برآمد ہونے کی دیر ہے، پھر یہ معاملہ ختم" وہ بولے۔

پھر اپنے دفتر میں آئے، وہاں سے گھر فون کیا، لیکن کسی نے بھی ریسیور نہ اٹھایا۔ خان رحمان اور پروفیسر داؤد کے نمبر ڈائل کیے، لیکن ان کی طرف سے بھی کوئی نہ بولا۔

" حیرت ہے۔ سب کے سب کہاں چلے گئے۔ کہیں محمود، فاروق اور فرزانہ کی تلاش میں تو نہیں نکل کھڑے ہوئے" یہ کہتے ہوئے وہ مُسکرا دیے، کیونکہ اس کے سوا کوئی بات نہیں ہو سکتی تھی۔

آخر وہ گھر پہنچے، لیکن تالا لگا ملا۔ آخر شہر کی سڑکوں پر نکل کھڑے ہوئے۔ اب وہ بھی اس کے سوا کیا کر سکتے تھے۔ حالات تو معلوم تھے نہیں کہ وہ تینوں کس طرح غائب ہوئے ہیں۔ مختلف سڑکوں پر دُور دُور تک نکلنے کے بعد آخر وہ شہر سے باہر جانے والی ایک سڑک کی طرف روانہ ہوئے اور پھر اچانک انہیں بریک لگانا پڑا، کیونکہ سڑک کے کنارے کچھ لوگ کھڑے تھے اور ایک کار بھی کھڑی تھی۔ اس کار کو وہ بخوبی پہچانتے تھے۔ نزدیک پہنچنے پر تو انہیں کوئی شک ہی نہ رہا۔ ادھر سڑک کے کنارے کھڑے لوگوں نے انہیں دیکھ لیا، وہ چلا اُٹھے:

" آپ۔ یعنی کہ آپ آ گئے"

"خان رحمان کہاں ہیں؟" انھوں نے سب پر ایک نظر ڈالنے کے بعد کہا۔

وہ ایک نیلی کار کے تعاقب میں گئے ہیں، نیلی کار سے ہم پر فائر کیا گیا تھا — ہم نے اس جگہ اسے روک لیا تھا، لیکن کار سے ہم پستول برآمد نہ کر سکے — اس طرح اسے جانے کی اجازت دینا پڑی، لیکن کار کے جانے کے بعد ہماری نظر درختوں کے جھنڈ میں پڑے ایک پستول پر پڑی — اس وقت ہمیں اپنی غلطی کا احساس ہوا اور خان صاحب پھر کار کے تعاقب میں چلے گئے — اب ہم چونکہ سب ایک کار میں نہیں آ سکتے تھے، اس لیے یہیں رُک گئے۔" بیگم جمشید نے جلدی جلدی کہا۔ انسپکٹر جمشید مسکرا دیے اور بولے:

"اگر وہ نیلی کار والا محمود، فاروق، فرزانہ یا میرے قابو میں آتا تو نکل نہیں سکتا تھا، خیر — آؤ اب اس طرف چلیں۔"

"والا نہیں جمشید — والی — اس کار کو ایک لڑکی چلا رہی تھی۔"

"اوہو اچھا۔" ان کے منہ سے نکلا۔

پھر وہ دونوں کاروں میں بیٹھ کر اس طرف روانہ ہو گئے — جس طرف خان رحمان نیلی کار کے پیچھے گئے تھے — قریباً دس کلومیٹر طے کرنے کے بعد خان رحمان سڑک کے کنارے کھڑے نظر آئے، ان کی کار بھی کھڑی تھی —

"کیوں خان رحمان — کیا رہا؟" انسپکٹر جمشید ہنس کر بولے۔

"ارے — جمشید — تم آ گئے — چلو یہ اچھا ہوا، اب تم خود ہی نبٹ لو اس معاملے سے۔" وہ بولے۔

"لیکن تم یہاں کیوں رُکے کھڑے ہو — تم تو نیلی کار کا تعاقب کر رہے تھے — جسے ایک لڑکی چلا رہی تھی۔"

"ہاں — تعاقب ضرور کر رہا تھا، لیکن وہ مجھ سے بہت چالاک نکلی۔" خان رحمان نے منہ بنایا۔

"وہ کیسے؟" پروفیسر داؤد حیران ہو کر بولے۔

"وہ سڑک پر کچھ کیلیں گراتی ہوئی گئی ہے — اور میری کار ایک بار پھر پنکچر ہو گئی ہے۔"

"ارے!" ان سب کے منہ سے ایک ساتھ نکلا اور پھر وہ ہنسنے لگے — خان رحمان بھی بے چارگی کے عالم میں ہنس رہے تھے:

"خیر کوئی بات نہیں — آؤ اب واپس چلیں — محمود، فاروق اور فرزانہ خود ہی آ جائیں گے — وہ اتنا آسان شکار نہیں ہیں — اور اگر وہ شہر میں ہی کسی جگہ ہیں تو ہم انھیں تلاش کرنے کی کوشش جاری رکھیں گے — اگرچہ یہ بھی کوئی آسان کام نہیں ہوگا۔"

"وہ تو ٹھیک ہے جمشید — سوال تو یہ ہے کہ وہ لڑکی کیا چاہتی تھی؟"

"تمھیں غلط سمت میں لے جانا — محمود، فاروق اور فرزانہ سے

"اس نمبر کی رجسٹریشن کسی کار کی نہیں ہے جناب۔"

"شکریہ۔" انھوں نے کہا اور ریسیور رکھ دیا۔

"لو بھئی۔ اس کی تو کار کے نمبر بھی جعلی تھے۔"

"دھت تیرے کی۔" خان رحمان نے جھلا کر کہا۔

"بھئی خان رحمان۔ یوں بات نہیں بنے گی۔ ران پر ہاتھ بھی مارو۔" پروفیسر داؤد مسکرائے۔

"نہ جانے تینوں کہاں ہوں گے۔" بیگم جمشید فکرمندانہ لہجے میں بولیں۔

"فکر نہ کرو بیگم۔ آئیے۔ ہم آپ لوگوں کو پہلے گھر پہنچا آئیں، اس کے بعد میں اور خان رحمان ان کی تلاش میں نکلیں گے۔" انسپکٹر جمشید نے کہا۔

"جیسے آپ کی مرضی۔"

وہ گھر کی طرف روانہ ہوئے، لیکن انھوں نے کچھ سوچ کر گھر جانے کی بجائے شہر سے باہر جنگل کی طرف جانے والی سڑک پر کار کا رُخ موڑ دیا، وہ سڑک کے دونوں طرف دیکھتے تیز رفتاری سے جا رہے تھے کہ اچانک انسپکٹر جمشید نے کار روک دی۔ ان کی پیشانی پر بل پڑ گئے:

"شاید میرے کان بج رہے ہیں۔" وہ بڑبڑائے۔

"کیا مطلب؟" خان رحمان بولے۔

"میرے کانوں میں عجیب سی آواز آ رہی ہے۔ ذرا سُننے کی کوشش کرنا خان رحمان۔"

"بھئی میرے کان اتنے تیز نہیں ہیں۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ میں بھی آواز سُن رہی ہوں۔" بیگم جمشید بولیں۔

انسپکٹر جمشید کار سے باہر نکل آئے اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگے، پھر ایک معمولی سی چیز پر ان کی نظریں جم گئیں۔

چیز معمولی سی ضرور تھی، لیکن عجیب بھی تھی۔

عقل کا لوہا

"اوہ! ہمیں یہاں لانے والے میرے چاقو سے واقف تھے۔" محمود نے بوکھلا کر کہا۔

"اب ۔ اب کیا ہوگا ، اب تک تو ہم اس چاقو کی وجہ سے ہی حوصلہ مند تھے ۔ اب حوصلہ کیسے بحال رکھیں گے۔"

"خدا کے سہارے ۔ اصل سہارا خدا کا ہوتا ہے ۔ نہ کہ ہتھیار کا۔ جنگیں بھی ہتھیاروں کے بل پر نہیں جیتی جاتیں۔" فرزانہ بولی۔

"تب پھر تم ہی بتاؤ ۔ ہمارے پاس اس مکان میں سے کیا، جس کی مدد سے ہم کچھ کام کر سکتے ہیں۔"

"ہمارے پاس عقل ہے ، ہاتھ اور پیر ہیں۔" فرزانہ بولی۔

"لیکن میرا خیال ہے ۔ آج ہماری عقلیں جواب دے جائیں گی۔" فاروق نے منہ بنایا۔

"یہ ضروری نہیں ۔ آؤ محمود ۔ دیوار سے لگ کر کھڑے ہو جاؤ۔" فرزانہ نے کہا۔

"اس سے کیا ہوگا۔"

"تمہارے اوپر فاروق کھڑا ہوگا اور اس کے اوپر میں ۔ شاید اس طرح میرے ہاتھ چھت تک پہنچ جائیں ۔ اور میں چھت پر پہنچ کر ضرور کچھ کر سکوں گی۔"

"لیکن میرا خیال ہے ، اونچائی زیادہ ہے۔" محمود بولا۔

"بھئی تجربہ کر دیکھنے میں کیا حرج ہے ۔ آخر یہاں کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہوگا ۔ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر تو بیٹھ نہیں سکتے۔"

"ہوں ٹھیک ہے۔"

محمود نے کہا اور دیوار کے قریب اکڑوں بیٹھ گیا ، فاروق نے اپنے دونوں پیر اس کے کندھوں پر رکھے اور پھر وہ بھی بیٹھ گیا ۔ اب فرزانہ فاروق کے کندھوں پر چڑھ گئی اور اس کے سر کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا ۔

"چلو محمود ۔ اب آہستہ آہستہ اٹھنا شروع کرو۔"

محمود پر اب ان دونوں کا بوجھ تھا ، لیکن اس نے پروا نہ کی اور اُٹھتا چلا گیا ۔ اس کے بعد فاروق اٹھا ، پھر فرزانہ ۔ اٹھنے کے بعد فرزانہ نے ہاتھ بلند کیے ، لیکن وہ چھت کی منڈیر کو نہ چھو سکے ۔ دیوار تک ہی رہ گئے ۔

"نہیں بھئی ۔ ہم اپنی پہلی کوشش میں ناکام ہو گئے ہیں ۔ میں نیچے چھلانگ لگا رہی ہوں۔"

یہ کہہ کر اس نے چھلانگ لگا دی ۔ فاروق بھی محمود کے کندھوں سے اُتر آیا ۔

" ہماری دُوسری کوشش کیا ہو گی فرزانہ ۔" فارُوق نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا ۔

" دُوسری کوشش ۔" فرزانہ کے مُنہ سے نِکلا اور پھر وُہ سوچ میں ڈوب گئی ۔

چند منٹ تک تینوں سوچ میں گم رہے ۔ آخر فرزانہ بولی :

" یُوں کام نہیں چلے گا ۔ پہلے ہمیں ان سب چیزوں کا جائزہ لینا ہوگا ، جو ہمارے پاس ہیں ۔"

" ہمارے پاس ، لیکن ہمارے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے ۔" محمود نے اسے گھورا ۔

" بھئی یہ تو نہ کہو ۔ کہ ہمارے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے ۔ کیا ہمارے پاس قلم نہیں ہیں ، گھڑیاں نہیں ہیں ، جیبوں میں نوٹ بُکیں نہیں ہیں ۔" فرزانہ نے جلدی جلدی کہا ۔

" ہاں بالکل ٹھیک ۔ یہ چیزیں ہمارے پاس واقعی موجود ہیں ، لیکن بھلا ہم ان چیزوں سے کیا کام لے سکتے ہیں ۔ قلم ، نوٹ بک اور گھڑیاں ہمارے کس کام آ سکتی ہیں ۔" محمود نے مُنہ بنا کر کہا ۔

" ان چیزوں میں ایک اور چیز شامل کر لو ۔" فرزانہ مسکرائی ۔

" اور وُہ کیا ؟" فارُوق جلدی سے بولا ۔

" عقل ۔ ہم عقل سے کام لے کر ان چیزوں کی مدد سے ضرور کوئی نہ کوئی گُل کھلا سکتے ہیں ۔" فرزانہ نے جواب دیا ۔

" دیکھو بھئی ۔ اگر کوئی گُل تمھاری سمجھ میں آ چکا ہے تو فوراً بتا دو ۔ ہم تمھاری عقل کا لوہا پہلے ہی مانتے ہیں ۔" فارُوق بے چارگی کے عالم میں بولا ۔

" عقل کا لوہا ۔" محمود بڑبڑایا ۔

" ہاں کیوں ۔ قابلیت کا لوہا مانا جا سکتا ہے تو عقل کا لوہا کیوں نہیں کہا جا سکتا اور پھر یہ تو کسی ناول کا نام بھی ہو سکتا ہے ۔"

" اُف توبہ ۔ ان حالات میں بھی یہ حضرت مذاق سے باز نہیں آ رہے ۔ حیرت ہے ، کمال ہے ۔" فرزانہ تِلملا اُٹھی ۔

" اگر میں ان حالات میں مذاق سے باز آ گیا تو ہم پر مُردنی سوار ہو جائے گی ۔" فارُوق نے گویا خبردار کیا ۔

" اوہ ہاں ۔ یہ تو خیر ٹھیک ہے ۔ ہاں فرزانہ تم کیا کہہ رہی تھیں ۔"

" یہ کہ ہمارے پاس جو چیزیں مُوجود ہیں ، ان چیزوں سے ہم کیا کام لے سکتے ہیں ، غور کے قابل تو بس صرف یہ بات ہے ۔"

" تو پھر آؤ فرزانہ ۔ غور کر لیتے ہیں ۔" فارُوق بولا ۔

تینوں صحن میں آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئے اور سوچ میں گم ہو گئے ۔ اچانک فارُوق اُچھل پڑا ۔ اس کی آنکھوں میں چمک

نمودار ہو گئی :

"اُف خدا — ہم ایک چیز کو تو بالکل ہی بھول گئے۔"

"کیا مطلب — کس چیز کو بھول گئے — تم ہمیشہ نامکمل بات کیوں کہتے ہو۔"

"ہمارے پاس ابھی ایک چیز اور ہے — اور ہم اس سے بہت زور دار کام لے سکتے ہیں۔"

"لیکن ہمیں تو یہاں اور کوئی چیز نظر نہیں آتی۔" فرزانہ نے حیران ہو کر کہا۔

"کہیں تم نے اپنی عقل کی آنکھیں بند تو نہیں کر لیں — یا پھر سرے سے عقل آج گھر تو نہیں چھوڑ آئیں۔"

"بھئی فاروق — پریشان نہ کرو، کیا کہنا چاہتے ہو۔"

"ہم اس دھاگے کو بھول گئے — جو ہمیں اغوا کرنے والے میخ سے باندھ گئے تھے۔"

"کیا مطلب — بھلا وہ دھاگا ہمارے کس کام کا۔" فرزانہ چلا اُٹھی —

"پہلے یہ بات تو تسلیم کرو کہ ہم اس کو بھول گئے تھے۔" فاروق مسکرایا۔

"اچھا چلو تسلیم کر لیا۔" محمود نے جلدی سے کہا۔

"اب ان چیزوں میں اس دھاگے کو بھی شامل کر لو۔"

"وہ تو خود بخود شامل ہو گیا، ہمارے شامل کرنے کی کیا ضرورت رہ گئی۔" فرزانہ نے مُنہ بنایا۔

"ہاں بالکل ٹھیک، اب آگے کہو — ہم اس دھاگے کا کیا کریں —"

"ابھی بتاتا ہوں۔" فاروق نے کہا، پھر جیب سے نوٹ بک نکالی، اس کا ایک ورق پھاڑا، اس ورق پر قلم سے موٹے موٹے لفظوں میں یہ جملہ لکھا :

"ہم اس مکان میں قید ہیں۔"

اس پُرزے کو اس دھاگے سے باندھا اور بولا :

"اب یہ کاغذ ہم دروازے سے باہر لٹکا دیتے ہیں، یعنی اسے جھری میں سے گزار دیتے ہیں، کوئی نہ کوئی راہ گیر تو اسے پڑھے گا۔"

"ترکیب — اس میں شک نہیں، بہت لاجواب ہے — اور آج فاروق مجھ سے بھی دو ہاتھ آگے بڑھ گیا۔" فرزانہ نے خوش ہو کر کہا۔

"معاف کرنا فرزانہ! مجھے تم سے دو ہاتھ آگے بڑھنے کا کوئی شوق نہیں۔" فاروق نے بُرا سا مُنہ بنا کر کہا۔

"چلو خیر کوئی بات نہیں۔" فرزانہ بولی۔

"تم سمجھی نہیں، میں کیا کہنا چاہتا ہوں۔"

"تو بتاؤ نا —" اس نے مُنہ بنایا۔

"میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میں تم سے دو ہاتھ نہیں۔ تیس چالیس ہاتھ آگے بڑھنا چاہتا ہوں۔"

"یار مذاق بند کرو۔"

وُہ دروازے کی طرف آئے۔ دھاگا دروازے کے نچلے حصّے میں سے باہر چلا گیا تھا، انھوں نے اسے کھینچ لیا۔ محمود نے کاغذ نیچے سرکا دینا چاہا تھا کہ فرزانہ بول اُٹھی:

"ارے ارے۔ یہ کیا کر رہے ہو؟"

"کیوں۔ اب کیا ہوا۔" محمود جھنا کر اس کی طرف پلٹا۔

"اس طرح تو یہ کاغذ چوکھٹ پر پڑا رہے گا۔ کیوں نہ ہم اسے دروازے کے اُوپر والے حصّے سے باہر سرکا دیں۔ اس طرح یہ ہوا سے اُڑے گا اور کسی راہ گیر کو عجیب ضرور لگے گا۔ اُوپر لٹکنے کی صورت میں اس کی طرف بہت جلد توجہ دی جائے گی۔"

"ہوں۔ بات تو ٹھیک ہے۔" فارُوق نے کہا۔

چنانچہ کاغذ کا پُرزہ دروازے کے اوپر سے باہر سرکانے کی کوشش کی گئی، لیکن دروازے کے اوپر والا حصّہ چوکھٹ سے کچھ اس طرح ملا ہوا تھا کہ کاغذ نہ جا سکا:

"اب کیا کیا جائے۔" محمود کے لہجے میں بے چارگی تھی۔

"مجبوری ہے۔ اب صرف نیچے سے ہی گزارا جا سکتا ہے۔"

انھوں نے یہی کیا، پھر محمود بولا:

"اب کیا کریں؟"

"اب ہم اپنی گھڑیوں اور ہاتھوں سے کام لیں گے۔" فرزانہ نے کہا۔

"گھڑیوں اور ہاتھوں سے۔ کیا مطلب؟"

"ہم میں سے ہر ایک ایک گھنٹے تک دروازہ دھپ دھپائے گا۔ تاکہ گزرنے والوں میں سے کوئی اس طرف متوجہ ہو جائے۔"

"ہاں۔ یہ بھی بہت ضروری ہے۔"

انھوں نے ایک ایک گھنٹے کی ڈیوٹی تقسیم کر لی، سب سے پہلے محمود کی باری طے ہوئی۔ وُہ دروازے سے لگ کر کھڑا ہو گیا اور لگا ہاتھ مارنے۔ مکان میں دھپ دھپ کی آواز گونجنے لگی۔ دس منٹ بعد ہی اسے یوں لگا جیسے ہاتھ درد کرنے لگے ہوں۔ اس نے ہاتھ روک لیے:

"کیوں۔ کیا ہوا؟"

"ایک ایک گھنٹے کی ڈیوٹی درست نہیں رہے گی۔ پندرہ پندرہ منٹ کی ٹھیک ہے۔"

"چلو یونہی سہی۔ ابھی پانچ منٹ باقی ہیں۔ پانچ منٹ اور ہاتھ چلاؤ۔" فارُوق مسکرایا۔

پانچ منٹ بعد فاروق کی باری آئی تھی، اس نے پندرہ

منٹ تک دروازے پر ہاتھ مارنے تھے اور پھر فرزانہ کی باری آئی ۔

ابھی محمود ہاتھ چلا رہا تھا کہ اچانک انھیں یوں محسوس ہوا کہ جیسے کچھ لوگ چلتے ہوئے دروازے تک آ رہے ہوں ۔

O

جس معمولی سی چیز پر ان کی نظر پڑی تھی ۔ وہ دھاگے سے بندھا ہوا ایک کاغذ کا پرزہ تھا جو ہوا سے کبھی تھوڑا سا اُٹھ جاتا اور پھر فرش سے چپک جاتا :

" یہ تو کسی بچے کا کھیل معلوم ہوتا ہے ۔" پروفیسر داؤد بولے ۔

" محمود ، فاروق اور فرزانہ بھی ایسے کھیلوں کے عادی ہیں ۔" انسپکٹر جمشید بولے اور اس مکان کی طرف قدم اٹھانے لگے ۔ اب وہ آواز صاف سنائی دینے لگی تھی :

" ضرور کوئی اس مکان کا دروازہ دھپ دھپا رہا ہے ۔" خان رحمان پُرجوش انداز میں بولے ۔

" ہوں ۔ واقعی ۔ میرا دل کہہ رہا ہے ۔ محمود ، فاروق اور فرزانہ اس مکان میں ہی قید ہیں ۔" انسپکٹر جمشید بولے ۔

آخر وہ دروازے کے نزدیک آ گئے ۔ دروازے کے ساتھ

سیمنٹ شدہ دیوار پر کسی نے چاک سے بڑے بڑے حروف میں لکھا ہوا تھا ۔ مکان برائے فروخت ہے ۔ سبزی منڈی میں حکیم نذیر سے ملیں ۔ بائیں طرف سیمنٹ پر کسی نے لکھا تھا ۔ اس مکان کو ہرگز نہ خریدیں ۔ آسیب زدہ ہے ۔ ہر وقت دھپ دھپ کی آوازیں آتی رہتی ہیں ۔

انھوں نے یہ الفاظ پڑھے ۔ دروازے پر ایک بڑا سا اور پرانا سا تالا لگا نظر آیا ۔ پھر وہ چٹ اُٹھا کر دیکھی ۔ دوسرے ہی لمحے انسپکٹر جمشید اُچھل پڑے :

" ارے ۔ محمود ، فاروق اور فرزانہ تو واقعی اندر بند ہیں ۔" یہ الفاظ انھوں نے بلند آواز میں کہے تھے ۔ دھپ دھپ فوراً بند ہو گئی :

" محمود ۔ کیا تم اندر ہو ۔"

" جی نہیں ۔ ہمارے فرشتے ہوں گے اندر تو ۔" فاروق کی آواز سن کر ان کے چہرے چمک اُٹھے ۔

" اچھا ۔ گھبراؤ نہیں ، ہم پہنچ گئے ہیں ۔ ابھی تالا توڑنے کا انتظام کرتے ہیں ۔"

" اب کیا گھبرائیں گے ۔ ہم تو پہلے بھی نہیں گھبرائے تھے ۔ ویسے دروازہ اندر سے بھی بند ہے ۔ اس مکان کی تمام کھڑکیاں اور دروازے اندر سے بند ہیں ۔ بڑی بڑی میخوں اور لکڑی کے

تختوں سے انھیں بند کیا گیا ہے۔" فاروق بولا۔

پہلے تالا توڑا گیا اور پھر دروازہ توڑنے کا انتظام کرنے میں پندرہ منٹ لگ گئے، اس دوران وہاں آس پاس کے بہت سے آدمی جمع ہو گئے۔ انسپکٹر جمشید نے ان سے سوال کیا:

"کیا آپ بتا سکتے ہیں، یہ مکان کس کا ہے؟"

"جی۔ جی ہاں۔ یہ عبدالحمید ٹیلر ماسٹر کا ہے اور وہ اسے فروخت کرنا چاہتے ہیں۔ کل اس میں چند کرائے دار آ چکے ہیں، پتا نہیں وہ کہاں گئے ہیں۔"

"عبدالحمید ٹیلر ماسٹر۔ لیکن یہاں تو لکھا ہے، حکیم نذیر، سبزی منڈی۔"

"پتا نہیں۔ یہ کون بے وقوف لکھ گیا۔"

"تو یہ مکان آسیب زدہ نہیں ہے؟"

"بالکل نہیں جناب۔ عبدالحمید ٹیلر ماسٹر آپ کو سروس روڈ پر ملیں گے، مکان نمبر ۹۔"

آخر دروازہ توڑ ڈالا گیا۔ محمود، فاروق اور فرزانہ باہر نکلتے ہی ان سے لپٹ گئے۔ انسپکٹر جمشید نے مکان کا اندر سے اچھی طرح جائزہ لیا۔ مکان بڑا مضبوط بنایا گیا تھا۔ ایک کھڑکی کے سوا تمام کھڑکیاں اور دروازے اندر سے بند کر دیے گئے تھے۔

واپسی پر محمود نے اپنی کہانی سنانا شروع کی۔

"تم نے غلطی کی۔ گھر سے اس طرح نہیں نکل پڑنا چاہیے تھا۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"جی بس۔ ہم بزدلی کا طعنہ برداشت نہیں کر سکے۔"

"خیر۔ یہ تو ہوا، لیکن سوال یہ ہے کہ مجرموں کا مقصد کیا تھا۔ آخر انھوں نے ایسا کیوں کیا؟"

"یہ تو ہم وہاں کچھ دن رہتے تو پتا چلتا۔ ہم تو فوراً ہی نکل آئے۔" فاروق بولا۔

"تو ہمیں مکان میں پھر سے بند کر دیں۔ اور مکان کی نگرانی شروع کرا دیں۔"

"نہیں۔ اب تمھارے مکان سے نکلنے کی کہانی ان سے چھپی نہیں رہے گی۔ خیر ہم اس معاملے کا سراغ بعد میں لگائیں گے۔ اس سے پہلے ایک خاص معاملہ درپیش ہے۔ پہلے اس کی طرف توجہ دیں گے۔"

اور انھوں نے میٹنگ روم میں پیش آنے والے واقعات تفصیل سے دہرا دیے۔

"یہ بہت برا ہوا۔ وہ موقعے پر ہی مر گیا۔ اس سے تو بہت قیمتی معلومات حاصل کی جا سکتی تھیں۔" محمود بڑبڑایا۔

آخر وہ گھر پہنچے۔ انسپکٹر جمشید فوراً ہی فون کی طرف متوجہ ہو گئے۔

"ہیلو اکرام — حمید رضوانی کے گھر کی تلاشی مکمل ہو گئی یا نہیں؟"

"جی ہاں! تلاشی لینے والے واپس آ چکے ہیں، لیکن وہ کاغذات تلاش نہیں کر سکے۔"

"کیا کہا — کاغذات تلاش نہیں کر سکے — یہ تو کوئی بات نہ ہوئی — کاغذات تو ہمیں ہر حال میں حاصل کرنے چاہییں۔"

"ہاں! کرنے تو چاہییں، پھر کیا کیا جائے۔"

"اچھا — میں خود ہی جاتا ہوں — یوں کام نہیں چلے گا معلوم ہوتا ہے، حمید رضوانی نے کاغذات کسی بہت ہی خفیہ جگہ رکھے ہوئے ہیں۔"

"کیا میں بھی وہاں پہنچوں؟"

"ہاں ٹھیک ہے — میں آدھ گھنٹے تک وہاں پہنچ رہا ہوں۔" یہ کہہ کر انھوں نے ریسیور رکھ دیا۔

"تو کیا آپ ہمیں ساتھ نہیں لے جائیں گے؟" فرزانہ بولی۔

"بھئی تم دروازہ کھٹکھٹا کر تھک گئے ہو گے — کچھ دیر آرام کر لو۔"

"ایسی کوئی بات نہیں ابا جان — آپ کے آنے سے صرف تیرہ چودہ منٹ پہلے ہی تو ہم نے دھپ دھپ شروع کی تھی۔"

"خیر تمھاری مرضی — تم بھی چلے چلو۔"

انھیں اٹھتے دیکھ کر بیگم جمشید نے جھنجھلائے ہوئے لہجے میں کہا:

"لو جی — ابھی آئے ہیں، اب پھر جا رہے ہیں، ہے کوئی تُک۔"

"کیا کیا جائے بیگم — کام ہی اس قدر اہم ہے — اگر ہم حمید رضوانی کے گھر سے کاغذات برآمد نہ کر سکے تو مزا نہیں آئے گا۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

جلد ہی وہ حمید رضوانی کے گھر کی طرف اڑے جا رہے تھے — ایک چھوٹی سی کوٹھی کے سامنے اکرام نے انھیں رکنے کا اشارہ کیا؛ گویا وہ ان سے پہلے ہی پہنچ چکا تھا۔

"چلو بھئی محمود، اپنا فرض ادا کرو۔" فاروق چہکا۔

محمود نے آگے بڑھ کر دستک دی — دروازہ ایک پندرہ سولہ سالہ لڑکے نے کھولا — ابھی تک حمید رضوانی کی موت کی خبر کو راز میں رکھا گیا تھا:

"جی فرمائیے؟"

"ہمارا تعلق حمید رضوانی صاحب کے محکمے سے ہے — ہم آپ کے گھر کی تلاشی لینے آئے ہیں — کیا آپ ان کے بیٹے ہیں؟"

"جی ہاں! لیکن آخر یہ ماجرا کیا ہے — ہم دفتر میں ابا جان کو کئی بار فون کر چکے ہیں — لیکن ادھر سے کوئی فون ہی نہیں اٹھاتا۔"

"دراصل آپ کے والد اور دوسرے افسر ایک بہت ضروری میٹنگ میں مصروف تھے۔"

"تو کیا اب وہ فارغ ہو چکے ہیں؟" لڑکا بے چین ہو گیا۔

"ہاں!" وہ بولے، "انکار نہ کر سکے۔

"تو پھر پہلے مجھے ان سے بات کر لینے دیں، کیونکہ اس سے پہلے بھی تو تلاشی لی جا چکی ہے۔"

"افسوس! انھیں فون کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔" انسپکٹر جمشید اداس لہجے میں بولے۔

"کیوں — فائدہ کیوں نہیں۔" لڑکے نے انھیں گھورا۔

"وہ آپ کو جواب نہیں دے سکیں گے — بہتر یہی ہو گا کہ آپ ہمیں تلاشی لینے دیں۔"

"جی نہیں — پہلے میں اپنے ابا جان سے اجازت لوں گا — میری بہنیں اور والدہ بہت پریشان ہیں — آج سے پہلے کبھی ہمارے گھر کی تلاشی نہیں لی گئی — آخر ہم نے کیا کیا ہے، کیا ہم چور ہیں — ڈاکو ہیں۔" لڑکا چیخ اٹھا۔

"اچھا تو پھر سنیے — آپ کے والد اب اس دنیا میں نہیں ہیں — انھوں نے خودکشی کر لی ہے۔"

"جی — کیا کہا — خودکشی کر لی ہے — نہیں — نہیں — یہ جھوٹ ہے۔" لڑکا پوری طاقت سے چیخا اور دروازہ کھلا چھوڑ کر اندر بھاگا —

جلد ہی دوڑتے قدموں کی آواز سنائی دی اور پھر تین لڑکیاں اور ایک عورت دروازے پر آ گئیں — ان کے پیچھے وہی

لڑکا تھا:

"یہ آپ نے کیا کہا جناب — آپ کون ہیں۔"

"میں نے ٹھیک کہا ہے — انھوں نے خودکشی کر لی ہے، میں انسپکٹر جمشید ہوں۔"

"نہیں نہیں — یہ — یہ غلط ہے۔" وہ بولیں۔

اور پھر گھر میں کہرام مچ گیا — اس وقت انسپکٹر جمشید نے محسوس کیا — انھوں نے غلطی کی — ابھی انھیں یہ اطلاع نہیں دینی چاہیے تھی — اب ان کے لیے تلاشی لینا ممکن نہیں رہا تھا — لیکن اب کیا کیا جا سکتا تھا، تیر کمان سے نکل چکا تھا — انھیں بہت انتظار کرنا پڑا — یہاں تک کہ بیگم حمید پھر باہر آئیں اور روتے ہوئے بولیں:

"ان — ان کی لاش کہاں ہے؟"

"ہسپتال میں۔"

"ہم وہاں جانا چاہتے ہیں۔"

"ہاں ضرور — آپ وہاں ہو آئیں، میرا اسسٹنٹ آپ کو وہاں لے جائے گا۔"

"شاید آپ خودکشی کی وجہ جاننے کے لیے گھر کی تلاشی لینا چاہتے ہیں۔"

"جی ہاں! یہی بات ہے۔"

"تو پھر آپ شوق سے اپنا کام کریں۔ ہم ہسپتال چلے جاتے ہیں۔"

"بہت بہت شکریہ!"

تھوڑی دیر بعد وہ تلاشی لے رہے تھے، ایک ایک چیز کو غور سے دیکھ رہے تھے۔ گھر کے پانچوں افراد بے چارے ہسپتال جا چکے تھے۔ بہت دیر تک تلاشی لینے کے بعد بھی انھیں وہ کاغذات نہ مل سکے۔ جن سے ظاہر ہو جاتا کہ حمید رضوانی غیر ملکی جاسوس تھا؛ تاہم ایک الماری میں رکھی ایک کتاب میں ایک پرانا سا خط ضرور ہاتھ لگا۔ انسپکٹر جمشید نے بے خیالی میں خط کو کھولا اور پھر خط لکھنے والے کا نام پڑھتے ہی وہ چونک اُٹھے:

"ارے! یہ خط تو راجہ منور نے لکھا ہے۔"

تب تو

"جی۔ راجہ منور کون؟" محمود حیران ہو کر بولا

"ہمارے دفتر کا ایک آفیسر۔ جو کچھ عرصہ پہلے فوت ہو گیا تھا۔ وہ ریکارڈ سیکشن کا انچارج تھا۔" یہ کہہ کر انھوں نے خط کی تحریر پر نظریں جما دیں، خط پر ۲۔ جولائی کی تاریخ تھی —

"میرے اچھے دوست حمید رضوانی! السلام علیکم۔

یہ خط میں آپ کو ایک بہت اہم ضرورت کے تحت لکھ رہا ہوں، لیکن خط میں اس بات کا ذکر نہیں کر سکتا۔ آج رات کو آپ میرے مکان پر آ جائیں — تفصیل سے بات کریں گے۔ شاید ہم مل کر اس کا کوئی حل ڈھونڈ لیں، اُمید ہے، آپ ضرور تشریف لائیں گے، دروازے کی گھنٹی بجانے کی ضرورت نہیں۔ آپ صدر دروازے سے تو آئیں بھی نہ، میں اپنے کمرے میں ہوں گا۔ اور بائیں باغ والی کھڑکی کھلی رکھوں گا۔ آپ سیدھے

باغ میں داخل ہو کر کھڑکی تک آ جائیں ، اس طرح
کسی کو یہ معلوم نہیں ہو گا کہ آپ آئے تھے ، میں چاہتا
ہوں ، یہ معاملہ جس قدر خفیہ رہے ، اتنا ہی اچھا ہے ،
آپ اپنے گھر میں بھی یہاں آنے کا کسی سے ذکر نہ
کریں ۔ شکریہ ۔ ٹھیک نو بجے میں آپ کا انتظار کر
رہا ہوں گا ۔ آپ کا دوست ۔

راجہ منور ۔"

انھوں نے خط پڑھ کر ان کے آگے کر دیا ، تینوں نے
بھی پڑھا اور حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکے :

" بہت خفیہ طریقے سے بلایا گیا تھا حمید رضوانی کو ۔ حیرت
ہے ۔"

" ہاں ! حیرت مجھے بھی ہوئی ہے ۔ خیر ۔ ہم اس خط کو بعد
میں دیکھیں گے ۔ پہلے تو تلاشی مکمل کر لیں ۔"

یہ کہہ کر انھوں نے خط کو حفاظت سے جیب میں رکھ لیا
اور پھر سے تلاشی میں مصروف ہو گئے ، لیکن ایک گھنٹے کی مسلسل
کوشش کے بعد بھی وہ کاغذات حاصل نہ کر سکے ۔

اتنے میں گھر کے افراد آ گئے ، انھوں نے اجازت لے لی
اور باہر نکل آئے ۔ اب وہ دفتر کا رخ کر رہے تھے ۔ انسپکٹر جمشید
گہری سوچ میں گم تھے ۔

" آپ ہم سے کچھ چھپا رہے ہیں شاید ۔" محمود نے ان کی طرف
غور سے دیکھا ۔

" نہیں بھئی ۔ جو کچھ مجھے معلوم تھا ، بتا چکا ہوں ۔ ہاں ! یہ
خط مجھے ضرور الجھن میں ڈال رہا ہے ۔"

دفتر پہنچ کر انھوں نے اکرام سے راجہ منور کی فائل منگوائی ۔
فائل کا مطالعہ کیا گیا ۔ راجہ منور کی موت دل کی حرکت بند
ہونے سے واقع ہوئی تھی ۔ وہ اپنے بستر پر مردہ پڑے ملے
تھے ۔ ڈاکٹر نے ان کا معائنہ کیا تھا اور پھر دل کی حرکت بند
ہو جانے کی خبر سنائی تھی ؛ چنانچہ انھیں دفن کر دیا گیا تھا ۔
ڈاکٹر صاحب نے پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کی ضرورت محسوس نہیں
کی تھی ۔

" اوہو ۔ یہ کیا !" اچانک انسپکٹر جمشید کے منہ سے نکلا ، پھر
ان کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں ۔

" کیا کوئی خاص چیز نظر آ گئی ہے ۔"

" ہاں ! بہت خاص ۔ ہمیں اسی وقت راجہ منور کے گھر جانا ہو
گا ۔ اکرام تمھیں معلوم ہے ۔ راجہ منور کا گھر کہاں ہے ۔"

" جی ہاں ۔ معلوم ہے ۔" اکرام نے کہا ۔

" تو پھر چلو ۔ جلدی کرو ۔"

" لیکن ابا جان ۔ آپ نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ نظر کیا اہم

چیز آئی ہے۔"

" چلو چلو — کار میں بتا دوں گا — اکرام تم کار چلاؤ۔"

" او کے سر!"

کار روانہ ہوئی تو انھوں نے فائل ان کے سامنے رکھ دی اور بولے :

" لو — فائل پڑھ لو — غور کرو — تمھیں معلوم ہو جائے گا، مجھے کیا چیز نظر آئی ہے۔"

" تو آپ خود ہی بتا دیجیے نا ابا جان۔" فاروق مسکرایا۔

" نہیں بھئی — میں نہیں بتاؤں گا — تمھیں خود ہی معلوم کرنا ہو گا — اور راجہ منور کا گھر آنے سے پہلے پہلے معلوم کرنا ہو گا۔" وہ بولے۔

وہ فائل میں گم ہو گئے۔

" راجہ منور کی وفات تین جولائی کو رات پونے نو اور سوا نو بجے کے دوران ہوئی — اور — اور —" محمود کہتے کہتے رک گیا، اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

" اور یہ کہ — حمید رضوانی بھی اس خط کی روشنی میں ۳ جولائی کو نو بجے راجہ منور سے ملنے گئے تھے۔" فرزانہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولی۔

" اُف خدا — یہ کیا معاملہ ہے — مجھے تو دال میں کالا نظر آتا

ہے۔" فاروق بوکھلا اُٹھا۔

" ہاں! یہی میرا خیال ہے۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

پندرہ منٹ بعد کار رک گئی — انھوں نے دیکھا، وہ ایک پُرانے اور بڑے سے مکان کے سامنے موجود تھے — کار سے اُتر کر محمود نے گھنٹی بجائی — فوراً ہی دروازہ کھلا اور ایک ادھیڑ عمر آدمی باہر نکلا :

" جی فرمائیے۔" اس نے قدرے پریشان ہو کر کہا۔

" آپ راجہ منور صاحب کے بھائی ہیں شاید۔"

" جی ہاں! اور آپ انسپکٹر جمشید ہیں، میں آپ سے ایک دو مرتبہ مل چکا ہوں، آئیے — تشریف لائیے۔"

وہ انھیں ڈرائنگ روم میں لے آیا — اطمینان سے بیٹھنے کے بعد بولا :

" فرمائیے — کیسے تکلیف کی؟"

" میرا خیال ہے، آپ کا نام راجہ اطہر ہے۔"

" جی ہاں — بالکل۔"

" راجہ منور آپ کے بھائی چار جولائی کی صبح کو اپنے بستر پر مُردہ ملے تھے — یہی بات ہے نا۔"

" جی ہاں — خیر تو ہے، آپ بہت سنجیدہ نظر آ رہے ہیں۔"

" مجبوری ہے جناب۔" فاروق بول اُٹھا۔

"کیا مطلب — مجبوری ہے؟"

"جی ہاں — موقع محل کے مطابق سنجیدہ ہونا ہی پڑتا ہے۔"

"ڈاکٹری رپورٹ کے مطابق ان کی موت رات پونے نو اور سوا نو کے درمیان ہوئی تھی۔" انسپکٹر جمشید جلدی سے بولے۔

"یہ بھی ٹھیک ہے، لیکن بات کیا ہے؟"

"میں چاہتا ہوں — ان کی نعش کو نکلوا کر پوسٹ مارٹم کرایا جائے۔"

"لیکن کیوں — اس کی کیا ضرورت پڑ گئی۔"

"مجھے شک ہے — وہ قدرتی موت نہیں مرے تھے — انھیں قتل کیا گیا تھا۔"

"کیا!" راجہ اطہر بلند آواز میں چلا اُٹھا۔

"جی ہاں! اس لیے کہ اس رات ٹھیک نو بجے ان سے ایک شخص نے ملاقات کی تھی۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"جی کیا مطلب — نو بجے ملاقات کی تھی — اُف خدا — وہ کون تھا؟"

"حمید رضوانی۔"

"حمید رضوانی صاحب — نہیں — مجھے اچھی طرح یاد ہے — اس رات ان سے حمید رضوانی ملنے نہیں آئے تھے۔" راجہ اطہر نے پُریقین لہجے میں کہا۔

"یہ خط پڑھ لیں، پھر بات کیجیے گا۔" انھوں نے حمید رضوانی کے گھر سے ملنے والا خط نکال کر ان کی طرف بڑھا دیا —

وہ حیرت زدہ انداز میں خط پڑھنے لگے، پھر ختم کرنے پر بولے:

"یا اللہ رحم! یہ میں نے کیا پڑھا ہے۔"

"اگر یہ حضرت نو بجے یہاں آئے تھے — اور انھوں نے راجہ منور صاحب کو مُردہ پایا تھا تو انھوں نے گھر کے افراد کو اطلاع کیوں نہیں دی — اور اگر اس وقت یہ زندہ تھے اور ان کے جانے کے بعد ان کی وفات ہوئی تو صبح انھیں ذکر کرنا چاہیے تھا — وہ یہ خط بھی پیش کر سکتے تھے، کیونکہ ڈاکٹر یہ کہہ چکا تھا کہ موت قدرتی ہوئی ہے، صرف ان کی حرکتِ قلب بند ہوئی — اس صورت میں انھیں چھپانے کی کیا ضرورت تھی، لیکن صاف ظاہر ہے کہ انھوں نے یہ بات چھپا لی — آخر کیوں؟"

"واقعی حیران کن معاملہ ہے، لیکن آپ یہ سوال جا کر حمید رضوانی سے کیوں نہیں پوچھتے — نعش نکلوانے کی بجائے کیا یہ بہتر نہیں رہے گا؟"

"افسوس! ہم ان سے یہ سوال نہیں پوچھ سکتے۔"

"کیوں؟" انھوں نے حیران ہو کر کہا۔

"اس لیے کہ — وہ مر چکے ہیں، انھوں نے خودکشی کر لی ہے —"

"ارے!" راجہ اطہر اُچھل پڑے۔

"اکرام — نعش کو نکلوانے کا بندوبست کرو — اب اس کے سوا

ئی چارہ نہیں۔"

"لیکن جناب۔ اس کا اب کیا فائدہ ہوگا۔ اگر یہ بات ثابت بھی ہو جائے کہ میرے بھائی کو قتل کیا گیا تھا تو حمید رضوانی کو سزا تو دلوائی نہیں جا سکے گی۔" راجہ اطہر نے حیران ہو کر کہا۔

"ہاں ٹھیک ہے، لیکن یہ تو معلوم کرنا ہی ہوگا کہ یہ جرم کیوں کیا گیا۔ راجہ منور صاحب نے حمید رضوانی کو کیوں بلوایا تھا۔ وہ کیا کہنا چاہتے تھے۔ کیا انھوں نے وہ بات بتائی یا نہیں، اس سارے راز کو معلوم کرنا ہوگا۔ ورنہ ہمیشہ اُلجھن رہے گی۔"

"ہوں۔ جیسے آپ کی مرضی۔" آخر انھوں نے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔

وہ ان سے رخصت ہوئے۔ دو گھنٹے بعد اکرام نے آکر رپورٹ دی:

"راجہ منور قدرتی موت نہیں مرے تھے۔ ان کے منہ پر تکیہ رکھ کر ان کا سانس روک دیا گیا تھا۔ اور ان کے مرنے کے بعد تکیہ سر کے نیچے رکھ دیا گیا۔"

"اوہ!" وہ دھک سے رہ گئے۔

"لیکن کیوں۔ آخر ایسا کیوں کیا گیا۔" محمود چلّا اُٹھا۔

"ایسا اس لیے کیا گیا کہ حمید رضوانی غیر ملکی جاسوس تھا۔ اس

کی زندگی کے اس رُخ کا راجہ منور کو پتا لگ گیا، انھوں نے اس سے بات کرنے کے لیے اسے اپنے گھر بلوایا۔ گھر بلوا کر جب بات کی گئی تو حمید رضوانی نے سوچا، اگر اس نے راجہ منور کو زندہ چھوڑ دیا تو وہ خود مارا جائے گا، لہٰذا اس نے انھیں ختم کر دیا اور خود چُپ چاپ واپس چلا آیا۔ چونکہ راجہ منور پہلے ہی اپنے کمرے کی کھڑکی کھولے اس کا انتظار کر رہا تھا، اس لیے گھر کے کسی فرد کو اس کی آمد کا پتا نہ چل سکا۔ اب جبکہ مخبری ہو گئی اور حمید رضوانی غیر ملکی جاسوس ثابت ہونے لگا تو عین میٹنگ کے دوران جب کہ میں تفتیش کرتا ہوا اس کے پاس پہنچنے ہی والا تھا، اس نے خود کشی کر لی۔"

"تب تو۔ تب تو۔" فاروق کہتے کہتے رک گیا۔

"تب تو کیا؟"

"تب تو یہ کیس ختم ہو گیا۔ سارا معاملہ سلجھ گیا۔"

"یہی تو مصیبت ہے۔ ایک اُلجھن باقی ہے۔" انسپکٹر جمشید بھنا کر بولے۔

"جی کون سی اُلجھن؟"

"ان کاغذات کی اُلجھن۔ آخر وہ کاغذات کہاں ہیں۔ ہر غیر ملکی جاسوس کے پاس اس کے کاغذات ضرور ہوتے ہیں۔ جو وہ کسی بہت ہی خفیہ جگہ پر رکھتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ حمید رضوانی کے

کاغذات کہاں ہیں — وہ ہمیں اب تک کیوں نہیں ملے۔"

"تو یوں کہیے — ہاتھی نکل گیا، دم رہ گئی۔" فاروق مسکرایا۔

"ہوں — اور ابھی ہمارا معاملہ بھی درمیان میں ہے — آخر اس نامعلوم آدمی نے، ہمیں اس عمارت تک — ارے۔" محمود کہتے کہتے رک گیا۔

"اللہ کا احسان ہے — ارے تو سنائی دیا۔" فاروق خوش ہو کر بولا —

"اور یہ ارے بلا وجہ نہیں — کوئی خاص وجہ ہے اس کی۔" فرزانہ بولی —

"ہاں! ہم نے اس مکان کے مالک سے مُلاقات کرنے کے بارے میں نہیں سوچا — اب جب کہ ہم اس کیس سے قریباً فارغ ہو چکے ہیں، تو کیوں نہ اس سے مل لیا جائے — کیا خبر دونوں معاملات کا آپس میں کوئی تعلق ہو۔" محمود نے پُرخیال لہجے میں کہا۔

"آپس میں تعلق — یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" فاروق نے بھنا کر کہا۔

"کیوں — ہو کیوں نہیں سکتا، اس سے پہلے بھی تو اکثر ایسا ہو چکا ہے۔"

"ہاں! یہ ناممکن نہیں — خیر آؤ، عبدالحمید ٹیلر ماسٹر سے بھی مل آئیں — ایک آدمی نے پتا بھی تو بتایا تھا اس کا، کیا پتا تھا بھلا۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"مکان نمبر ۹ — سروس روڈ۔" فرزانہ بولی۔

"بھئی واہ — یادداشت ہو تو ایسی۔" فارُوق خوش ہو کر بولا۔

"اور کیا تم جیسی۔" فرزانہ نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"لیجیے — یہ تعریف کرنے کا انعام ملا ہے۔" اس نے جل کر کہا۔

چند منٹ بعد وہ سروس روڈ کی طرف جا رہے تھے — مکان نمبر ۹ تلاش کرنے میں انھیں کوئی دقت نہیں ہوئی — محمود نے دستک دی — ایک بوڑھے آدمی نے دروازہ کھولا:

"عبدالحمید ٹیلر ماسٹر آپ ہی ہیں؟"

"ہاں! کیا بات ہے۔" اس نے اکھڑے لہجے میں کہا۔

"آپ کا کوئی مکان برائے فروخت ہے؟"

"اوہ ہاں! بالکل۔" اس نے فوراً نرم پڑتے ہوئے کہا۔

"کیا اسے آپ نے ان دنوں کرائے پر دے رکھا ہے۔"

"ہاں! لیکن میں آپ کو خالی کرا کر فروخت کروں گا، فکر نہ کریں۔"

"کرائے داروں کو کب دیا تھا؟"

"ابھی ایک روز پہلے ہی — اس نے تو صرف ایک ماہ کے لیے کرائے پر لیا ہے — آپ فکر نہ کریں۔" اس نے بے قراری کے عالم میں کہا۔

"اچھا نہیں کریں گے فکر۔"

"اس نے کوئی تحریر تو لکھ کر دی ہو گی آپ کو؟"

"ہاں بالکل — میں تو تحریر لکھوائے بغیر کسی کو کرائے پر دیتا ہی نہیں۔" وہ بولا —

"مہربانی فرما کر وہ تحریر دکھائیں۔"

"بات کیا ہے جناب — کیا آپ مکان خریدنے نہیں آئے —" اس نے مایوسانہ لہجے میں کہا اور لہجہ پھر سخت ہو گیا۔

"جی نہیں —" یہ کہہ کر انھوں نے اپنا کارڈ آگے کر دیا۔

وہ خوف زدہ ہو گیا اور جلد سے کرایہ نامہ اٹھا لایا — جونہی اس تحریر پر محمود کی نظر پڑی، وہ چونک اُٹھا:

"یہ بالکل ویسی ہی تحریر ہے ابا جان — جو ہمیں ملی تھی۔"

"ہوں — تب تو بن گیا کام —" یہ کہہ کر وہ عبدالحمید کی طرف مڑے:

"یہ تحریر امانت کے طور پر چند دن ہمارے پاس رہے گی۔"

"ج — جی — جی — کوئی بات نہیں۔" اس نے بوکھلا کر کہا۔

تحریر لے کر وہ دفتر میں آئے — اکرام کے حوالے کی اور بولے:

"ریکارڈ میں چیک کرو بھئی — یہ تحریر کسی سے ملتی جلتی تو نہیں۔"

"جی بہتر۔" اکرام بولا اور تحریر لے کر چلا گیا۔

آدھ گھنٹے بعد اس کی واپسی ہوئی — چہرے پر جوش کے آثار تھے:

"یہ شوبا سوڈانی کی تحریر ہے سر۔"

"ہم اس سے کہاں مل سکتے ہیں اکرام۔"

"بہت پیچیدہ سا راستہ ہے سر — مجھے آپ کے ساتھ جانا پڑے گا۔" اکرام بولا۔

"اچھا تو پھر چلو۔"

وہ روانہ ہوئے — کار کو سڑک پر چھوڑ کر انہیں تنگ گلیاں طے کرنا پڑیں، آخر ایک پرانے سے مکان کے دروازے پر اکرام نے دستک دی:

"کیا یہ سزا یافتہ ہے؟"

"جی ہاں! ابھی چند ماہ پہلے ہی تو رہا ہوا ہے — میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ پھر مجرمانہ سرگرمیوں میں حصہ لینا شروع کر دیا ہوگا۔" اس نے افسوس زدہ لہجے میں کہا۔

"ہوں — ایک بار جو جرائم میں پھنس جاتا ہے، نکلنے کی کوشش کرتا ہی نہیں۔"

اسی وقت دروازہ کھلا —

"ارے — ارے باپ رے۔" دروازہ کھولنے والے کے منہ

سے نکلا —

ساتھ ہی محمود، فاروق اور فرزانہ اچھل پڑے، کیونکہ یہ آواز بالکل وہی تھی جو سرخ رنگ کی کار چلانے والے کی تھی —

گواہ بن جائیے

ان کے چہرے پر حیرت کے آثار دیکھتے ہی انسپکٹر جمشید بھی سمجھ گئے کہ یہ وہی شخص ہے جو انھیں اغوا کرکے اس عمارت تک لے گیا تھا:

"ہیلو شوبے — کیا حال ہے۔" اکرام بولا۔

"آپ — آپ لوگ اور یہاں۔"

"ہاں بھئی — کیا ہمیں اندر آنے کے لیے بھی نہیں کہو گے۔"

"اوہ ہاں — آئیے — آئیے — کیوں نہیں۔" اس نے بوکھلا کر کہا۔

وہ اندر داخل ہوئے —

"کون ہے شوبے —" ایک عورت کی آواز سنائی دی۔

"کوئی نہیں بیگم — تم اپنا کام کرو۔" اس نے بھنا کر کہا۔

"کیوں — میں اپنا کام کیوں کروں۔" ان الفاظ کے ساتھ ہی ایک نوجوان عورت ان کے سامنے آگئی اور پھر اس کے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار طاری ہو گئے:

"ارے — یہاں تو بہت سارے لوگ موجود ہیں۔" یہ کہتے ہی وہ پلٹ پڑی۔

"ٹھہریے — اب جب آپ یہاں آ ہی گئی ہیں تو ہماری گفتگو کی گواہ بن جائیے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"گفتگو کی گواہ — کیا مطلب؟" اس نے حیران ہو کر کہا۔

"ہاں! ہم مسٹر شوبلے سے بہت اہم بات چیت کرنے آئے ہیں، لہٰذا اس بات چیت کے دوران آپ کا موجود ہونا بھی ضروری ہے، کیا آپ مسٹر شوبلے کی بیوی ہیں؟"

"ہاں بالکل۔" اس نے فوراً کہا۔

"بہت بہت شکریہ — مسٹر شوبلے — اس تحریر کو آپ پہچانتے ہیں — اگر نہیں تو میں عبدالحمید ٹیلر ماسٹر کو یہیں بلوا لیتا ہوں۔"

تحریر پر نظر پڑتے ہی شوبلے کا رنگ اُڑ گیا:

"اسے بلوانے کی ضرورت نہیں، یہ میری ہی تحریر ہے۔" اس نے مُردہ آواز میں کہا۔

"اور محمود، فاروق اور فرزانہ کو بھی وہ تحریر تم نے ہی لکھی تھی؟"

"ہاں! یہ بھی ٹھیک ہے۔"

"لیکن وہ کار کس کی تھی؟"

"چوری کی — کاریں چرانا میرا بائیں ہاتھ کا کام ہے۔"

"اور وہ کار کہاں ہے؟"

"میں صرف اپنا کام نکالنے کے لیے کار چوری کرتا ہوں — جونہی کام پورا ہوا، کار کسی سڑک پر چھوڑ دی — اور وقتی ضرورت کے لیے ایک دو نمبر پلیٹیں اپنے پاس رکھتا ہوں۔"

"ہوں! تو تم اقرار کرتے ہو کہ ان تینوں کو تم نے ہی اس عمارت میں قید کیا تھا؟"

"ہاں! یہ ٹھیک ہے۔" اس نے کہا۔

"بہت خوب! اب یہ بھی بتا دو کہ تم نے ایسا کیوں کیا تھا؟"

"آپ جانتے ہی ہیں، میں اس قسم کے کام اپنے لیے نہیں، دوسروں کے لیے کرتا ہوں اور دوسروں سے اپنا معاوضہ لیتا ہوں۔"

"تو یہ کام تم نے کسی دوسرے کے لیے کیا تھا — کون ہے وہ —"

"میں نہیں جانتا، اس نے میرا معاوضہ پہلے ہی ادا کر دیا تھا اور کام کی نوعیت بتا دی تھی؛ چنانچہ میں نے پہلے تو وہ عمارت کرائے پر لی اور پھر محمود، فاروق اور فرزانہ کے نام رقعہ لکھا، اور خود ہی انہیں پکڑ لایا — کار پہلے ہی چوری کر چکا تھا؛ چنانچہ انہیں اس عمارت میں پہنچا دیا — انہیں بے ہوش کرنے کے لیے کلوروفارم کا انتظام بھی کر لیا تھا اور اپنی ناک پر گیس ماسک چڑھا رکھا تھا — مکان کے دروازوں اور کھڑکیوں پر کھڑی

کے تختے پہلے ہی جڑ دیے گئے تھے ۔ یہ ہے کُل کہانی ، میں نہیں جانتا کہ یہ کام کس نے مجھ سے لیا ہے ۔"

"بھئی جھوٹ نہ بولو ۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے ۔

"جی کیا مطلب ۔ آپ کے خیال میں مَیں جھوٹ بول رہا ہوں ۔" اس نے حیران ہو کر کہا ۔

"ہاں ! اس لیے کہ تم نے اس شخص کے لیے کچھ اور بھی کام کیا ہے ۔" انسپکٹر جمشید پُر اسرار لہجے میں بولے ۔

"یہ غلط ہے ، میں نے اس کے لیے بس اتنا ہی کام کیا ہے ۔"

"اچھا یہ بات ہے ۔ خیر سنو ۔ کیا تمہاری بیوی کا نام روشی منیر نہیں ہے ۔"

"کیا !!! " وہ اچھل پڑے ۔ دونوں کی آنکھیں حیرت اور خوف سے پھیل گئیں ۔

O

"ہاں ! اگر تم انکار کرو گے تو میں اپنے دوست کو یہاں بلوا لوں گا ۔ اس صورت میں وہ تمہاری بیوی کو پہچان لیں گے ۔ اب کہو ، کیا کہتے ہو ۔"

"یہ ٹھیک ہے ، روشی سے بھی میں نے کچھ کام لیا ہے ،

لیکن اس میں ایک فیصد بھی جھوٹ نہیں ہے کہ ہم اس آدمی کے بارے میں بالکل کچھ نہیں جانتے ۔"

"ہوں خیر ۔ اکرام ۔ ان دونوں کو حوالات میں پہنچا دو ۔ ہم گھر جا رہے ہیں ، اگر کوئی خاص بات ہو تو فون کر دینا ۔"

"جی بہتر !" اس نے کہا اور وہ گھر کی طرف روانہ ہو گئے ۔

گھر پہنچے تو بیگم جمشید نے اطلاع دی :

"ڈرائنگ روم میں ایک ملاقاتی آپ کا انتظار کر رہا ہے ۔"

"اوہ اچھا ۔" یہ کہہ کر وہ ڈرائنگ روم کی طرف مڑ گئے ۔ ابھی تک پروفیسر داؤد اور خان رحمان وغیرہ یہیں تھے ، اس لیے گھر میں بہت رونق نظر آ رہی تھی ۔

وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے اور پھر انسپکٹر جمشید کے منہ سے نکلا :

"ساجد تم ۔ خیر تو ہے ۔"

ساجد ان کے دفتر میں ملازم تھا ۔ وہ حمید رضوانی کا چپراسی تھا ، اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں ۔ انہیں دیکھ کر اٹھ کھڑا ہوا ، پھر ان کے بیٹھنے کے بعد بیٹھ گیا اور بولا :

"میں ایک بہت ہی خاص بات آپ کو بتانا چاہتا ہوں ، لیکن ہو سکتا ہے ، وہ بات صرف میرے خیال میں خاص ہو اور آپ کے نزدیک اس کی ذرا بھی اہمیت نہ ہو ۔"

"اس بات کی فکر نہ کرو — بات بتاؤ۔" انسپکٹر جمشید نرم آواز میں بولے —

"حمید رضوانی صاحب نے خودکشی کر لی — یہ خبر اس وقت تک پورے دفتر میں پھیل چکی ہے — یہ بھی کہ انھوں نے خودکشی ایک انگوٹھی کے ذریعے کی — جو وہ انگلی میں پہنے ہوئے تھے۔"

"ہاں یہ ٹھیک ہے — تو پھر تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"صرف اور صرف یہ کہ حمید رضوانی صاحب کبھی بھی انگوٹھی نہیں پہنتے تھے۔"

"کیا مطلب؟" انسپکٹر جمشید، محمود، فاروق اور فرزانہ اُچھل پڑے۔

"جی ہاں! میں نے ان کی اُنگلی میں کبھی بھی انگوٹھی نہیں دیکھی۔"

"ہوں — بات واقعی اہم ہے — اوہ — اوہ۔" انسپکٹر جمشید یکایک بے چین ہو گئے — ایسے میں محمود نے کہا:

"لیکن ابا جان! ہو سکتا ہے، انھوں نے آج خاص طور پر انگوٹھی پہنی ہو — تاکہ ضرورت پڑنے پر اپنے آپ کو ختم کر سکیں۔"

"لیکن میں ایک اور بات محسوس کر رہا ہوں — آؤ جلدی کرو، کہیں مجرم ہاتھ سے نکل نہ جائے۔"

وہ تیزی سے اُٹھے اور باہر کی طرف دوڑے، ایسے میں انھوں نے ساجد سے کہا:

"ٹھیک ہے ساجد — تم جا سکتے ہو، بہت بہت شکریہ۔"

وہ کار میں بیٹھے اور ایک سمت میں چل پڑے —

"اب ہم کہاں جا رہے ہیں ابا جان؟"

"وہ انگوٹھی واقعی حمید رضوانی کی نہیں تھی — اب مجھے یقین آ گیا ہے، کیونکہ مجھے ایک اور بات یاد آئی ہے۔"

"جی — وہ کیا؟"

"وہ — وہ انگوٹھی حمید رضوانی کی۔۔۔۔"

انسپکٹر جمشید کہتے کہتے رک گئے، کیونکہ اسی وقت ایک کار اچانک سامنے آ گئی تھی — انھوں نے پورے بریک لگائے — اور ایکسیڈنٹ ہوتے ہوتے بچا:

"یا اللہ رحم۔" فرزانہ کانپ کر بولی۔

"بال بال بچے۔" محمود بولا۔

"خاموش رہو — مجھے کچھ سوچنے دو۔"

ایک مکان کے سامنے وہ رک گئے — دستک دینے پر ایک نوجوان آدمی باہر نکلا اور انھیں دیکھ کر چونک اُٹھا:

"غفور خان — تمھارے صاحب انگلی میں انگوٹھی پہننے کے عادی تو نہیں ہیں؟"

"جی — جی ہاں — بالکل ہیں جناب۔"

"شکریہ — یہی بات معلوم کرنی تھی — آؤ بھئی چلیں۔"

"جی کیا مطلب — یہی بات معلوم کرنے آئے تھے آپ؟"

"ہاں! بس یہی بات معلوم کرنی تھی — وجہ جلد معلوم ہو جائے گی، فکر نہ کرو۔"

اسے ہکا بکا چھوڑ کر وہ وہاں سے روانہ ہوئے اور ایک کوٹھی کے سامنے رُکے — پھاٹک کے دوسری طرف ایک سُرخ رنگ کی کار کھڑی دکھائی دی — اسے دیکھ کر ان کی پیشانی پر بل پڑ گئے — محمود نے دستک دی تو ایک ملازم باہر آیا:

"تمھارے صاحب کہاں ہیں بھئی؟"

"جی — وہ تو کلب گئے ہوئے ہیں۔"

"کلب — کون سے کلب؟" انسپکٹر جمشید حیران ہو کر بولے۔

"جوڈو کراٹے کلب — کوئین روڈ۔"

"اوہ شکریہ — ہم انھیں وہیں مل لیتے ہیں۔" وہ بولے۔

اب ان کی کار کوئین روڈ کی طرف اڑی چلی جا رہی تھی:

"اُف خدا — تو کیا یہ مجرم ہیں؟"

"ہاں — اس میں اب کوئی شک نہیں رہ گیا۔" انسپکٹر جمشید نے پُر جوش لہجے میں کہا۔

اور پھر وہ کلب میں داخل ہوئے — ایک کھلے میدان میں بہت سے لوگ جوڈو کراٹے کی مشق کر رہے تھے —

"ہمیں کے ایم جاودانی صاحب سے ملنا ہے، ذرا انھیں

یہاں بلا دیں۔" انسپکٹر جمشید نے کلب کے ایک ملازم سے کہا۔

"اچھا!" اس نے کہا اور تیز تیز قدم اٹھاتا چلا گیا۔

فوراً ہی انھوں نے کے ایم جاودانی کو اپنی طرف آتے دیکھا — نزدیک آنے پر اس نے حیرت بھری نظر ان پر ڈالی اور پھر بولا:

"خیر تو ہے انسپکٹر صاحب — آپ یہاں؟"

"ہم آپ کو لینے آئے ہیں۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"لینے آئے ہیں — کیا مطلب — کہاں جانا ہے؟"

"حوالات۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"حوالات — میں سمجھا نہیں۔"

"بات صرف اتنی سی ہے جاودانی صاحب کہ راجہ منور قدرتی موت نہیں مرا تھا — بلکہ اس کے منہ پر تکیہ رکھ کر دباؤ ڈالا گیا تھا — اور پھر جب اس کا دم گھٹ گیا تو تکیہ اس کے سر کے نیچے رکھ دیا گیا — گھر کے افراد نے یہی خیال کیا کہ وہ سوتے میں مر گیا۔"

"اوہ!" کے ایم جاودانی کے منہ سے بوکھلائے ہوئے لہجے میں نکلا —

"اور اس کے منہ پر تکیہ رکھنے والے آپ تھے — تاکہ راجہ منور کی جگہ لے سکیں اور اپنا کام بخوبی کر سکیں۔"

"نہیں !!!" وہ خوف زدہ انداز میں چلّا اُٹھا۔

"جی ہاں! بالکل یہی بات ہے۔۔ اور اس سے بھی مزے کی بات یہ ہے کہ حمید رضوانی صاحب نے خودکشی نہیں کی۔۔ وہ تو انگوٹھی پہننے کے عادی ہی نہیں تھے۔۔ ہاں آپ ضرور انگوٹھی پہننے کے عادی ہیں۔ آپ نے اس انگوٹھی کی نوک حمید رضوانی کے ہاتھ میں چبھو دی۔ اس طرح زہر ان کے جسم میں سرایت کر گیا۔ یہی وجہ تھی کہ ان کی حالت ردی ہو رہی تھی، پھر وہ گر گیا اور یہ آپ تھے جو سب سے پہلے اسے اٹھانے کے لیے جھکے تھے۔ دراصل اسی لمحے آپ نے انگوٹھی ان کی اُنگلی میں پہنائی تھی۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا۔"

کے ایم جاودانی کے منہ سے ایک لفظ نہ نکل سکا۔ اس کا چہرہ تاریک پڑ گیا۔ اسے خاموش پا کر انسپکٹر جمشید بولے:

"اور یہی وجہ ہے کہ حمید رضوانی کے گھر سے وہ کاغذات نہیں ملے۔ ملتے بھی کیسے۔ وہ بے چارے تو غدار تھے ہی نہیں، غیر ملکی جاسوس تو آپ ہیں۔ لہذا ہاتھ اوپر اٹھا دیں۔ میں آپ کو گرفتار کر رہا ہوں۔"

ان الفاظ کے ساتھ ہی کے ایم جاودانی نے بیرونی دروازے کی طرف چھلانگ لگا دی اور ان کے دیکھتے ہی دیکھتے گیٹ سے باہر نکل گیا۔

جھوٹ بے چارہ

انسپکٹر جمشید نے بھی اس کے پیچھے بلا کی رفتار سے چھلانگ لگائی اور بھاگتے چلے گئے۔ محمود، فاروق اور فرزانہ بھی بے تحاشہ دوڑے۔ انھوں نے دیکھا۔ کے ایم جاودانی اپنی کار کی طرف دوڑ رہا تھا۔ ان کے نزدیک پہنچنے سے پہلے ہی وہ کار میں بیٹھ گیا اور پھر کار تیر کی طرح ان کی طرف آئی۔ وہ جھڑک کر اِدھر اُدھر ہو گئے۔ اور کار ان کے درمیان سے نکل گئی۔ اب وہ اپنی کار کی طرف بھاگے۔ آن کی آن میں اس میں بیٹھے اور کار کے پیچھے لگ گئے:

"اُف خدا۔ ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ہمارا اغوا بھی اسی شخص نے کرایا ہو گا۔" فرزانہ چلّا اُٹھی۔

"کیا مطلب۔ تم نے یہ نتیجہ کس طرح نکال لیا۔" محمود حیران ہو کر بولا۔

"وہ دیکھو۔ مجرم کی کار نیلی ہے۔ انکل خان رحمان اور

دُوسرے افراد پر نیلی کار سے ہی فائر کیا گیا تھا اور اس وقت نیلی کار کو شوبے کی بیوی چلا رہی تھی ؛ گویا نیلی کار اس کام کے لیے خود مجرم نے انھیں دی تھی — اور اس کی کوٹھی میں ہم ابھی ابھی ایک سرخ رنگ کی کار بھی دیکھ چکے ہیں — گویا ہمیں اغوا کرنے کے لیے وہ کار شوبے کو اسی نے دی تھی — ہاں ان لوگوں نے وقتی طور پر نمبر پلیٹ تبدیل کر دی ہو گی — ورنہ وہ کار وہی تھی — اس وقت ہم توجہ نہیں دے سکے ۔"

"فرزانہ ٹھیک کہتی ہے — اس شخص نے تمھیں صرف اس لیے اغوا کرایا تھا کہ میں اس میٹنگ میں شریک نہ ہو سکوں اور تمھاری تلاش میں نکل جاؤں — آئی جی صاحب نے مجھے اجازت بھی دے دی تھی ، لیکن میں نے منظور نہیں کیا تھا — یہ چاہتا تھا ، میری توجہ اس کے معاملے کی طرف نہ ہو سکے — بلکہ شاید وہ یہ خیال کر رہا تھا کہ میری موجودگی میں اس کے لیے حمید رضوانی کی اُنگلی میں انگوٹھی پہنانا مشکل کام ہوگا ، لیکن جب میں نہ گیا تو یہ مشکل کام اسے کرنا ہی پڑا — اور یہ بھی حقیقت ہے — میرا ذہن واقعی اس وقت تم میں اُلجھ گیا تھا ۔
تو یہ اس کی چال تھی — افسوس ہم بہت دیر سے سمجھے ۔" انسپکٹر جمشید کہتے چلے گئے ۔

انسپکٹر جمشید رفتار بڑھاتے چلے گئے — درمیانی فاصلہ کم ہوتا گیا اور پھر نیلی کار کو زور دار بریک لگے ، انھوں نے مجرم کو کار سے چھلانگ لگا کر جنگل کی طرف لڑھکتے دیکھا —

انھوں نے بھی کار روکی اور اس کے پیچھے چھلانگیں لگا دیں :
"تم بچ کر نہیں جا سکتے — میں چاہوں تو تمھیں گولی کا نشانہ بنا سکتا ہوں ، لیکن میں تمھیں زندہ سلامت پکڑنے کا ارادہ رکھتا ہوں ، اس لیے پستول استعمال نہیں کروں گا ۔"

نہ جانے انسپکٹر جمشید کے ان الفاظ میں کیا تھا ، مجرم ایک جھٹکے سے رکا اور ان کی طرف گھوم گیا — اس کے چہرے پر ایک دلکش مسکراہٹ تھی :

"پہلے یہ بات کیوں نہ بتا دی ۔" اس نے کہا ۔

"کون سی بات ؟"

"یہی کہ مجھ پر فائر کرنے کا ارادہ نہیں رکھتے ۔"

"تو اب کیا ہو گیا ہے ۔" فاروق نے برا سا منہ بنایا ۔

"اب اپنے الفاظ پر قائم رہنا — یعنی پستول نہ نکالنا ۔" اس نے غصہ دلانے والے انداز میں کہا ۔

"چلو — نہیں نکالوں گا پستول — پھر کیا ارادہ ہے ؟"

اس نے کوئی جواب نہ دیا اور ان کی طرف ایک ایک قدم بڑھتا رہا — اس کے تیور خطرناک محسوس کر کے وہ ہوشیار

ہو گئے — مناسب فاصلے پر آتے ہی اس نے چھلانگ لگا دی — چھلانگ وحشیانہ انداز میں لگائی گئی تھی — اگر وہ پہلے ہی ہوشیار نہ ہوتے تو ضرور اس کی پلیٹ میں آ گئے تھے —

وہ منہ کے بل گرا اور ساتھ ہی انسپکٹر جمشید نے اس کی کمر پر ایک لات رسید کر دی — وہ دھپ سے زمین پر چپک گیا، لیکن پھر انسپکٹر جمشید دھڑام سے گرے، کیونکہ وہ بجلی کی تیزی سے پلٹا تھا اور انھیں ایک شاندار اڑنگے پر رکھ لیا تھا — اس سے پہلے کہ وہ سنبھل سکتے — اس نے ایک ایک لات ان کی طرف گھما ڈالی، لیکن تینوں چونکہ فاصلے پر تھے، اس لیے صاف بچ گئے — اور پھر اس کی طرف بڑھے، لیکن اس وقت تک انسپکٹر جمشید سنبھل چکے تھے — وہ ان کے درمیان میں آ گئے —

اس بار مجرم نے سر کی ٹکر آزمائی — نشانہ ان کی ناک کا لیا تھا، انھوں نے مکا آگے کر دیا — سر اور مکا ایک دوسرے سے ٹکرا گئے — انسپکٹر جمشید کو یوں لگا جیسے کسی لوہے کی چیز پر مکا دے مارا ہو — آنکھوں کے سامنے نیلے پیلے ستارے ناچ گئے، لیکن چوٹ کو پی گئے اور دوسرے ہاتھ کا مکا اس کی ٹھوڑی پر رسید کیا — یہ مکا اس نے کندھے پر وصول کیا اور لڑکھڑا گیا — ایسے میں ان کی لات چل گئی — جو اس

کی کمر پر لگی — ایک بار پھر وہ دھپ سے گرا — اور پھر ساتھ ہی دوسری لات پڑی — بس پھر کیا تھا — انسپکٹر جمشید نے اسے لاتوں پر رکھ لیا، پھر بھی وہ اتنا آسان شکار ثابت نہ ہوا — اور آخر وقت تک اس کے دم خم باقی رہے، لیکن کب تک — آخر زمین چاٹنا پڑی —

"دیکھ لیجیے جناب — ہم نے پستول نہیں نکالا — نکالتے بھی کیسے — پستول تو ہمارے پاس تھا ہی نہیں۔" فاروق نے شوخ آواز میں کہا۔

اب انھوں نے اسے باندھا اور کار میں ڈال کر وہاں سے روانہ ہوئے — پہلے سیدھے آئی جی صاحب کے گھر پہنچے — آئی جی صاحب اسے بندھا دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئے:

"یہ کیا بھئی؟"

"حمید رضوانی بے چارہ غدار نہیں تھا — غدار تو دراصل یہ ہے، اس نے زہریلی انگوٹھی اس کی انگلی میں پہنا دی تھی۔"

"یہ — میں کیا سن رہا ہوں۔"

"ابھی تو ہم آپ کو بہت کچھ سنا سکتے ہیں انکل۔" فاروق مسکرایا —

"اوہ — ہاں! میں ضرور سنوں گا — یہ معاملہ حد درجے اہم ہے۔"

انھوں نے تمام تر تفصیلات سنا دیں اور پھر مجرم کو قانون

کے حوالے کر دیا گیا۔ اس کے بعد وُہ عملے کے ساتھ مجرم کے گھر پہنچے۔ ایک گھنٹے کی محنت کے بعد کاغذات حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

"اور اب قصّہ ختم ہوا۔ لہٰذا ہم گھر چل رہے ہیں، کیونکہ ہمارا گھر اس وقت رونق کی زد میں آیا ہوا ہے۔" محمود نے کہا۔

"اپنے گھر جانے سے پہلے ہم اس گھر میں جائیں گے جس گھر کی رونق اُجڑ گئی ہے، کیونکہ انھیں ایک صدمہ یہ بھی پہنچ چکا ہے کہ حمید رضوانی غدار تھا۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"اوہ ہاں! یہ بھی ٹھیک ہے۔" فرزانہ نے کہا۔

وہ حمید رضوانی کے گھر پہنچے۔ گھر کے افراد نے انھیں اُداس انداز میں دیکھا:

"فرمائیے۔ اب کیا رہ گیا ہے؟" بیگم رضوانی بولیں۔

"ہم آپ سے معافی مانگنے آئے ہیں۔"

"معافی۔ کیسی معافی۔" وہ حیران ہو کر بولیں۔

"آپ کو یہ جان کر یقیناً خوشی ہو گی کہ آپ کے شوہر غدار نہیں تھے۔ مجرم نے چال بازی سے کام لے کر انھیں غدار ثابت کر دیا تھا۔ اب ہم اس معاملے کی تہہ تک پہنچ چکے ہیں اور یہ بھی سن لیں کہ انھوں نے خودکشی نہیں کی تھی۔

بلکہ مجرم نے ان کے جسم میں زہر داخل کیا تھا۔"

"اوہ!" وُہ دھک سے رہ گئیں۔

ہمدردی کے چند بول ادا کرنے کے بعد وہ وہاں سے رخصت ہوئے اور گھر پہنچے:

"بھئی جمشید۔ یہ کیس تو ختم ہوتا معلوم نہیں ہوتا۔ تم اِدھر گھر آتے ہو، اُدھر گھر سے نکل جاتے ہو، لہٰذا ہمیں تو اجازت ہی دے دو۔"

"نہیں خان رحمان۔ یہ نہیں ہو سکتا۔"

"کیا مطلب۔ کیا نہیں ہو سکتا۔" وہ حیران ہو کر بولے۔

"یہ انکل۔ کہ آپ کو اجازت نہیں مل سکتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس بار ہم واقعی کیس سے فارغ ہو کر لوٹے ہیں۔" فرزانہ نے شوخ انداز میں کہا۔

"ارے۔ کیا سچ۔"

"جی ہاں۔ بالکل سچ۔ جھوٹ کا سوال اس لیے پیدا نہیں ہوتا کہ وہ ہم بولتے ہی نہیں۔" محمود مسکرایا۔

"جھوٹ بے چارہ بھی ہمیں دل ہی دل میں پتا نہیں کیا کیا صلواتیں سناتا ہوگا۔" فاروق بڑبڑایا۔

"لیجیے۔ اب جھوٹ بھی صلواتیں سنانے لگا۔" فرزانہ نے بُرا سا منہ بنایا۔

بلکہ مجرم نے ان کے جسم میں زہر داخل کیا تھا۔"
"اوہ !" وہ دھک سے رہ گئے۔
ہمدردی کے چند بول ادا کرنے کے بعد وہ وہاں سے رخصت ہوئے اور گھر پہنچے :
"بھئی جمشید۔ یہ کیس تو ختم ہوتا معلوم نہیں ہوتا۔ تم ادھر گھر آتے ہو، اُدھر گھر سے نکل جاتے ہو، لہذا ہمیں تو اجازت ہی دے دو۔"
"نہیں خان رحمان۔ یہ نہیں ہو سکتا۔"
"کیا مطلب۔ کیا نہیں ہو سکتا۔" وہ حیران ہو کر بولے۔
"یہ انکل۔ کہ آپ کو اجازت نہیں مل سکتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس بار ہم واقعی کیس سے فارغ ہو کر لوٹے ہیں۔"
فرزانہ نے شوخ انداز میں کہا۔
"ارے۔ کیا سچ۔"
"جی ہاں۔ بالکل سچ۔ جھوٹ کا سوال اس لیے پیدا نہیں ہوتا کہ وہ ہم بولتے ہی نہیں۔" محمود مسکرایا۔
"جھوٹ بے چارہ بھی ہمیں دل ہی دل میں پتا نہیں کیا کیا صلواتیں سناتا ہوگا۔" فاروق بڑبڑایا۔
"لیجیے۔ اب جھوٹ بھی صلواتیں سنانے لگا۔" فرزانہ نے بُرا سا منہ بنایا۔

"تم جھوٹ کی بات کرتی ہو۔ فاروق تو پتا نہیں کس کس چیز سے حلوائیں سنوا سکتا ہے۔" محمود نے فوراً کہا۔

"ہاں اور کیا۔ میں تو یہ کام تم دونوں سے بھی لے سکتا ہوں۔" فاروق نے معصومانہ لہجے میں کہا۔

اور سب مسکرا دیے۔